ماہنامہ

ندائے اعتدال

علی گڑھ

جنوری ۲۰۲۰ء | جلد ۱۱ | شمارہ ۷ | جمادی الاول ۱۴۴۱ھ

بانی: ڈاکٹر محمد غیاث صدیقی ندوی رحمۃ اللہ علیہ

زیر سرپرستی

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ العالی

(صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ)

زیر نگرانی

ڈاکٹر سعد ماحی

(سکریٹری علامہ ابوالحسن علی ندوی ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر فاؤنڈیشن)

مدیر

ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی

tariqnadwialig@yahoo.co.in, Mob.9897776652

معاون مدیر

محمد فرید حبیب ندوی

مجلس مشاورت

- مولانا سید سلمان الحسینی ندوی
- مولانا بلال عبدالحی حسنی ندوی
- مولانا محمد الیاس ندوی بھٹکلی
- ڈاکٹر ابوسفیان اصلاحی
- محمد قمر عالم لکھنوی
- ڈاکٹر جمشید احمد ندوی
- مولانا محمد اخلاق ندوی

مجلس ادارت

- پروفیسر مسعود خالد علیگ
- مجیب الرحمٰن عتیق ندوی
- محمد قمر الزماں ندوی

شرح خریداری

فی شمارہ:	25:00 روپے
سالانہ:	250:00 روپے
سالانہ اعزازی ممبرشپ:	500:00 روپے
بیرونی ممالک:	30$ ڈالر
لائف ممبرشپ (۲۰ سال):	4000:00 روپے

سرکولیشن انچارج

سعید احمد انصاری 9045616218

محمد آصف اقبال ندوی 9454210673

Bank Acount Detail: Mr Saeed Ahmad Ansari
Acount No: 6561000100039197
IFSC code: PUNB0656100
Punjab National Bank, Medical Road, Aligarh-202002
Mob. 9808850029

خط و کتابت کا پتہ:

مدرسۃ العلوم الاسلامیہ، ہمدرد نگر 'ڈی' کوارسی بائی پاس، علی گڑھ

e-mail: nidaeaetidal@gmail.com

Designed and composed by Abdullah Maroofi, Mob. 8218439622; email-almarufi.abdullah369@gmail.com

Editor: Dr. M. Tariq Ayubi Nadwi

سعید احمد ندوی نے آئیڈیل گرافکس انٹرپرائزیز، علی گڑھ سے چھپوا کر دفتر علامہ ابوالحسن علی ندوی ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر فاؤنڈیشن، ہمدرد نگر ڈی، علی گڑھ سے شائع کیا

Printed & Published by Saeed Ahmad Nadwi behalf of the office of Allama Abul Hasan Ali Nadwi Educational & Welfare Foundation Hamdard Nagar-D, Jamalpur, Aligarh at Ideal Graphics Enterprises, Patwari Nagla, Aligarh

visit us: www.nadwifoundationaligarh.org

فہرست مضامین

۱-	قرآن کا پیغام	اپنی اور اپنے بچوں کی فکر کیجئے!	محمد عارف ندوی	
۲-	اداریہ	دل تو عاجز دیکھ رہا ہے حدنظر سے آگے بھی	مدیر	۳
۳-	پیامِ سیرت	کیا ان حالات میں ہمارے ایمان میں اضافہ ہوا؟	فرید حبیب ندوی	۸
۴-	مطالعۂ افکار	مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ- متکلم اسلام	پروفیسر محسن عثمانی	۱۰
۵-	نقد و نظر	غامدی فکر کی بنیادی گمراہی	مولانا یحییٰ نعمانی	۱۳
۶-	تعلیم و تربیت	تربیت اولاد- چند اہم گوشے	ڈاکٹر محمد طارق ایوبی	۲۳
۷-	خطبات	طلبۂ مدارس کے نام ایک اہم پیغام	ڈاکٹر محمد طارق ایوبی	۳۱
۸-	تاریخ کے جھروکوں	مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری	ڈاکٹر محمد طارق ایوبی	۳۷
۹-	مطالعت	حاجی امداد اللہ مہاجر مکی اور ان کا شعری سرمایہ	ندیم احمد انصاری	۴۸
۱۰-	مطالعۂ مذاہب	سناتن دھرم اور اسلام- چند غلط فہمیوں کا ازالہ	محمد عبداللہ بن شمیم ندوی	۵۱
۱۱-	تعارف و تبصرہ	''بچوں کی تربیت کے رہنما اصول'' ایک تأثر	مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن الاعظمی	۶۰
۱۲-	// //	بچوں کی تربیت کے رہنما اصول	ڈاکٹر عبید اقبال عاصم	۶۱
۱۳-	شعر و ادب	کچھ علاجِ شب کرو	ابوالمجاہد زاہد	

❁❁❁

نوٹ: مضمون نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔ عدالتی چارہ جوئی علی گڑھ کی ہی عدالت میں ہوسکتی ہے۔

اداریہ

دل تو عاجز دیکھ رہا ہے حدِّ نظر سے آگے بھی

ہندوستان کی پارلیمنٹ کے سرمائی اجلاس میں شہریت ترمیم بل پاس ہوکر ایک قانون بن گیا، اس بل پر بحث کے دوران وزیر داخلہ کے جو تیور دیکھنے کو ملے اور جو لہجہ سننے کو ملا وہ نازی تیور اور نازی لہجہ سے کچھ کم نہ تھا، قانون پر بحث میں بھی ہٹلر شاہی کا نظارہ تھا، ''اکثریت'' کا جادو سر چڑھ کر بول رہا تھا، صاف محسوس ہو رہا تھا کہ فسطائیت عروج پر ہے، ظالم نشۂ طاقت میں چور ہے، غلبہ کا جنون بدمست ہاتھی کی شکل اختیار کر چکا ہے، بل پر بل پاس ہو رہے ہیں اور قانون پر قانون بنائے جا رہے ہیں، مگر اپوزیشن بھی مبہوت نظر آتا ہے اور عوام بھی سکتے میں ہیں، کسی کو بولنے کی جرأت نہیں، حکومت کی پالیسیوں پر تنقید ملک سے غداری شمار کی جانے لگی ہے، ایسا اس وقت ہوتا ہے جب کوئی ملک ڈکٹیٹرشپ کی طرف بڑھنے لگتا ہے اور واقعہ یہ ہے کہ ہمارا ملک اس وقت ملک اسی راہ پر ہے، پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں میں ایک پارٹی اور اس کے ہمنواؤں کی اکثریت ہے، مخالفین میں بولنے کی تاب نہیں، آنکھیں جو منظر دیکھ رہی ہیں وہ بہت بھیانک اور خوفناک ہے، کسی ملک میں ایک ہی جماعت طاقتور ہو جائے اور دوسری پارٹیاں ختم ہو جائیں یا بالکل کمزور پڑ جائیں تو یہ جمہوریت کو ڈکٹیٹرشپ میں تبدیل کرنے کے لیے کافی ہے، اس وقت ہندوستان کے اکثر حصہ پر ایک جماعت کی حکومت ہے، پارلیمنٹ سے عدالت تک اسی کی زبان ہے، اسی کا قلم ہے اور اسی کی جے جے کار ہے، بالکل وہ نظارہ ہے جو کسی ایسے ملک کا ہوتا ہے جہاں ایک ہی پارٹی کا وجود ہو یا ایک ہی پارٹی کی طاقت وحکومت (Single Party Rule) ہو، ہم نے جب بی جے پی کی دوبارہ حکومت بنی تھی اور اَمِت شاہ کو وزیر داخلہ بنایا گیا تھا، اس وقت لکھا تھا کہ ہندوستان اور یہاں کا مسلمان خطرے میں ہے، یہ بھی لکھا تھا کہ اب یہاں وہی بول سکتا ہے، جو بے داغ ہو اور جس کے اندر جذبۂ عزیمت موجزن ہو، ورنہ اب یہاں یا تو حکمراں جماعت کی زبان بولی جائے گی یا پھر فائلیں کھول دی جائیں گے اور جیل خانے شریف مجرموں سے آباد کر دیے جائیں گے، آپ نے دیکھا ہوگا کہ شریف لوگ جیل بھیجے جا رہے ہیں، ان میں وہ بھی ہیں جن کا واقعی کوئی جرم ہے اور وہ بھی ہیں جو صرف نظریاتی دشمن ہونے کے سبب بھیجے گئے، دوسری طرف ایک بھیڑ ہے جو حکومت کے جابرانہ رویہ کو قیام امن کی کوشش قرار دے رہی ہے، گرتی معیشت کو طاقتور ترین معیشت سے تعبیر کر رہی ہے، صورت حال تو یہ بھی ہے کہ مسلم دشمنی اور ہندو راسٹر کی

بنیادی سوچ رکھنے والی تنظیم کو کچھ لوگ قومی یکجہتی کا علمبردار بتا رہے ہیں اور دلچسپ بات یہ ہے کہ عقل سے عاری لوگ اسے مضحکہ خیز فلسفہ کو تسلیم بھی کر رہے ہیں، کیا یہ ممکن ہے کہ آر ایس ایس کے رویّہ میں لچک آئی ہو، سوچنے کی بات ہے کہ جس نے سو سال محنت کی ہو اور فصل جب کٹنے کو ہو تو وہ فصل کو آگ کیسے لگا دے گا، آر ایس ایس اگر پیار محبت اور یکجہتی کی بات کرنے لگے تو پھر تو اس کی شناخت ہی ختم ہو جاتی ہے۔

بہر حال جو صورت حال ہے وہ انتہائی مہیب منظر پیش کر رہی ہے، اس دوران شہریت ترمیم کا جو قانون پاس کیا گیا، وہ انتہائی خطرناک ہے، یہ صحیح ہے کہ فریب دینے کی خاطر اس کی بابت کہا جا سکتا ہے کہ وہ ملک کے مسلم باشندوں کے خلاف نہیں ہے، لوگ اور بہت عقلمند لوگ اس جھانسے میں آئے بھی ہیں، جبکہ ماہرین اسے آئین ہند کی بنیادی روح کے خلاف قرار دے رہے ہیں، (یہاں ہم تفصیل میں نہیں جائیں گے) واقعہ یہ ہے کہ یہ CAB جو اَب CAA ہو چکا ہے NRC کے لیے لایا گیا ہے، اس میں بنیادی طور پر پڑوس کے تین ملکوں پاکستان، بنگلہ دیش اور برما سے آنے والی اقلیتوں کو مذہبی بنیاد پر بھارتی شہریت دینے کی بات کہی گئی ہے، صرف اسلام اور مسلمانوں کو اس سے مستثنیٰ رکھا گیا ہے، یہ سوال الگ موضوع بحث بن سکتا ہے کہ دیگر پڑوسی ملکوں کی مذہبی اقلیتوں کو پھر کیوں چھوڑا گیا؟ اور جن ملکوں کی مذہبی اقلیتوں کو شہریت دینے کی بات کہی گئی کیا واقعی وہاں ان کے ساتھ غیر انسانی سلوک کیا جا رہا ہے؟ سچائی یہ ہے کہ یہ قانون آسام میں NRC کے عمل سے بھارتی شہریت سے محروم ہوئے ۱۱/ لاکھ سے زائد ہندوؤں کے لیے لایا گیا ہے، جنھیں بنگلہ دیشی کہہ کر شہریت دے دی جائے گی اور مسلمانوں کو محروم کر دیا جائے گا، جہاں تک NRC کا عمل ہے تو وہ بھی خطرناک ترین عمل ہے، جب یہ عمل کیا جائے گا تو کم از کم ۵۰/ سے ۶۰/ فیصد لوگ اس کی زد میں آئیں گے، غریب و مزدور پیشہ لوگ کہاں سے اور کس طرح کاغذات بنوائیں گے، ایک بڑی آبادی ہے جس کے پاس کاغذات کے نام پر ایک ٹکڑا بھی نہیں، پھر لوگوں کو جن پریشانیوں کا سامنا ہوگا جو مصیبت عام شہریوں پر ٹوٹے گی وہ تو الگ ہے، جو بے چارے عقلمند NRC کا استقبال کر رہے ہیں اور دستاویزیں تیار کرنے کے مشورے دے رہے ہیں، کوئی ان سے پوچھے کہ آخر سابق صدر جمہوریہ فخر الدین علی احمد کے اہل خاندان کیوں غیر ملکی قرار دے دیے گئے، ثناء اللہ خان جو تیس سال فوج کے ملازم رہے، کارگل کی جنگ لڑی، کیپٹن رہے، وہ آخر کیوں ڈِٹینشن سینٹر بھیج دیے گیے، وہ بھی اپنی شہریت نہ ثابت کر سکے تو پھر کون کر سکے گا؟ آنکھیں جو کچھ دیکھ رہی ہیں اس پر یقین نہ کیجئے آئندہ کا منظر نامہ بہت خطرناک ہے:

آنکھیں جو کچھ دیکھ رہی ہیں اس سے دھوکا کھائیں گیا
دل تو عاجزؔ دیکھ رہا ہے حدِّ نظر سے آگے بھی

NRC کا عمل اگر ہوتا ہے تو ارتداد کی ایک خوفناک لہر چلنے کا خطرہ ہے، اس لہر کی بنیاد یہی نیا قانون بنے گا، ابھی سے صورت حال یہ ہے کہ ایک مفتی صاحب سے ایک صاحب نے پوچھا کہ مفتی صاحب NRC میں اگر ہم اپنی شہریت کے لیے کاغذ پر عیسائی بتا دیں اگر چہ دل سے مسلمان رہیں تو کوئی حرج؟ مگر ہم مطمئن ہیں اور کاغذات کی تیاری کا مشورہ رہے ہیں، اس صورت حال کا ادراک اور مذہبی بنیاد پر بنائے گئے اس قانون سے ہونے والے نقصان کا اندازہ غیر مسلم دانشوروں

نے ہم سے زیادہ کیا، نوجوانوں کو اس کا ادراک زیادہ ہوا، وہ پوری بصیرت کے ساتھ جامعہ ملیہ اسلامیہ سے لے کر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی تک سڑکوں پر آ گئے، انھوں نے آئین ہند کی روح سیکولرزم کے تحفظ کی خاطر ہر طرح کی قربانی کا عزم کیا، کیوں کہ اگر آئین کی یہ روح سلب کر لی گئی تو پھر نہ اقلیتیں محفوظ ہوں گی، نہ اقلیتی ادارے اور نہ مذہب پر عمل کی آزادی ہوگی نہ دعوت اسلام کے مواقع، یہ نوجوان سمجھ گئے مگر افسوس کہ جن کو سمجھنا تھا وہ نہ سمجھے، کچھ لوگ تو واقعی مصلحتوں کا شکار رہتے ہیں یا ''وہن'' کے مرض میں مبتلا ہیں یا معذور ہیں، کچھ لوگ مخلص ہیں مگر ان کے اندر کچھ کر گذرنے کی تاب وطاقت نہیں، خیر ان لوگوں سے گلہ وشکوہ کرنے سے کیا حاصل، بس یہ کہہ کر دل کو بہلائیے:

اس مصلحت پرست کو جینے کا حق نہیں
جس کو زباں ملی ہو مگر بے زباں رہے

میرے نزدیک NRC کا عمل اس ملک کے مسلمانوں کو بے حیثیت کرنے کے لیے ہوگا، ان میں دوسرے درجہ کے شہری کا احساس پیدا کرنے کے لیے اور پارلیمنٹ کو حزب مخالف کے وجود سے آزاد کرنے کے ایک حربہ کے طور پر انجام دیا جائے گا، بایں طور کہ نام، ولدیت اور اسپیلنگ وغیرہ کو لے کر شہریت سے محروم کر دیا جائے گا، پھر ووٹر لسٹ سے نام خارج ہوگا، یہ عمل بالخصوص ان حلقوں میں زیادہ ہوگا جہاں مسلم ووٹ موثر ہوتا ہے، اسی طرح وہاں سے ان کے پارلیمنٹ میں اپوزیشن کے نہ ہونے کے خواب کی تکمیل کی ایک منزل طے ہوگی، پھر جب تک دوبارہ ووٹر لسٹ میں نام نہیں آئے گا تب تک یہ شخص دوسرے درجہ کا شہری شمار ہوگا، پھر اس کے ساتھ گھر اور محلّہ میں رہتے ہوئے کیا کیا ہوسکتا ہے کچھ نہیں کہا جاسکتا، کیونکہ حکومت سب کے لیے ڈِٹینشن سینٹر نہیں کھولے گی، اس کے بس کا بھی نہیں اور نہ سب کو ملک بدر کرسکتی ہے مگر اپنے ہی ملک اور اپنے ہی گھر میں بندھوا مزدور اور لاشئہ بے جان بنا کر چھوڑنا آسان ہے، اس کے ساتھ ساتھ جو جُگّی، جھونپڑی اور مزدور طبقہ ہے اس کو ڈِٹینشن سینٹر بھی بھیجا جاسکتا ہے، ظاہر ہے کہ اس صورت حال کے بعد جیسی اور جس طرح کی زندگی ہوگی اس کے تصور سے ہی روح کانپ جاتی ہے، اس لیے اس کا صرف ایک حل ہے کہ CAA اور NRC کا مکمل بائیکاٹ کیا جائے، جو غیر مسلم دانشوران اس کے مخالف ہیں ان کی قیادت میں بائیکاٹ اور عدم تعاون کی تحریک چلائی جائے، جو اس پر اطمینان کا اظہار کرے اور حکومت کی زبان بولتے ہوئے استقبال کرے اسے ملت کا بہی خواہ قطعی نہ سمجھا جائے، اس سے ابوالمجاہد زاہد کی زبان میں صاف کہہ دیا جائے۔

اس زندگی پر موت کو ترجیح دیجئے
جس زندگی میں عزم نہ ہو، حوصلہ نہ ہو

خوش آئند یہ ہے کہ نئی نسل میں ملی شعور ابھی زندہ ہے، قومی سلامتی کا شعور اور ملی غیرت وحمیت ابھی باقی ہے، آئینِ ہند کے تحفظ کی خاطر فسطائیت کے خلاف نئی نسل نے مورچہ سنبھالا، جبکہ تجربہ کار لوگ یا تو غفلت میں رہے یا مصلحت نے بیڑیاں ڈال دیں، بات یہیں تک ہوتی تو غنیمت تھی، افسوس تو یہ ہوا کہ ایک بزرگ نوجوانان ملت کے ان مظاہروں کو غلط اور غیر اسلامی عمل قرار دینے لگے، انھیں کون بتائے کہ وہ دارالاسلام میں نہیں دارالعہد اور ایک جمہوری ملک میں ہیں، جمہوریت

میں احتجاج ومظاہرہ عوام کا جمہوری حق ہے، اگر اس حق کا بروقت اور درست استعمال نہ ہوتو جمہوریت ڈکٹیٹرشپ میں بدل جاتی ہے، ملک Single Party Rule کی طرف بڑھنے لگتا ہے، بھارت اسی جانب بڑھ رہا تھا ہر طرف سناٹا تھا، ہو کا عالم تھا، ضروری تھا کہ ایک طاقت ور ملک گیر آواز اٹھے اور لوگوں کے اندر سے خوف وہراس نکالے، الحمدللہ وہ آواز بلند ہوئی، اور ہمہ جہت وہمہ گیر ہوئی، لاکھ کوششوں کے باوجود بھی فرقہ پرست اس کو ہندو مسلم قضیہ نہ بنا سکے، یہ منظر بھی دیکھا گیا کہ جامعہ کے طلبہ کی حمایت میں دہلی یونیورسٹی، جے این یو، بنارس ہندو یونیورسٹی کے ساتھ ملک بھر کے تعلیمی اداروں سے طلبہ نے نکل کر زبردست مظاہرے کیے، جامعہ اور اے ایم یو کے طلبہ کے ساتھ پولیس کی بربریت اپنی انتہا کو پہنچ گئی، مگر جامعہ کے طلبہ کی جانبازی واستقامت سے یہ تحریک ملک گیر بن گئی اور تاریخ میں ان کی قربانی ہمیشہ کے لیے درج کر لی گئی، ۱۵؍دسمبر کی شام پولیس نے جو ظلم ڈھایا اور بربریت کی جو تاریخ رقم ہوئی وہ انتہائی بھیانک اور گھناؤنی، غیر قانونی وغیر جمہوری تھی، مگر اس سے زیادہ گھناؤنا وشرمناک عمل دیر رات دیکھنے میں آیا، جامعہ میں اس ظالمانہ کارروائی کے بعد جے این یو کے طلبہ کی دانشمندانہ اور بروقت کال (Call) پر تمام طلبہ اور دہلی کے عوام نے جب دہلی پولیس کے ہیڈکوارٹر کو گھیر رکھا تھا، جامعہ کے سینکڑوں طلبہ کے زخمی ہونے اور ایک طالب علم کے شہید ہونے کی خبر عام ہو چکی تھی، اس کے باوجود ایک مسلم رہنما جو پہلے ہی CAB اور NRC پر حکومت کی حمایت کا اعلان کر چکے تھے وہ اپنے چند حواریوں کے ساتھ اپنے نام کے ساتھ زندہ آباد کے نعرے لگواتے وہاں پہنچے، میں سمجھ نہ سکا کہ وہ آنسو پونچھنے پہنچے تھے یا زخموں پر نمک چھڑکنے؟ بہرحال اس موقع پر کسی شخص یا تنظیم کے نام کے ساتھ زندہ آباد کے نعرے کا کیا مطلب؟ پھر بھی لوگوں نے ان کے ساتھ جو سلوک کیا وہ بہرحال بروقت اور مناسب تھا۔

نوجوان طلبہ کی چھیڑی ہوئی یہ تحریک ملک گیر بن چکی ہے، شمال مشرقی ریاستیں سراپا احتجاج بن چکی ہیں، حکومت کے پہلے سے طے شدہ پروگرام منسوخ ہو رہے ہیں، ہزاروں کروڑ کا خسارہ ہو چکا ہے، ہندو مسلمان سبھی دستور کے بنیادی ڈھانچہ کی خلاف ورزی پر سینہ سپر ہیں، اور حکومت کو یہ پیغام دے رہے ہیں کہ غرور ونشہ کی بھی ایک حد ہوتی ہے! نشہ میں دھت ہو کر اگر آئین کی توہین کا ارادہ کیا تو تمہاری ساری مشنری کو عوام اپنی طاقت سے ناکام کر دیں گے، واقعہ یہ ہے کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ اور علی گڑھ مسلم یونیوسٹی کے شاہین صفت نوجوانوں نے اس موقع پر جس بیداری پامردی اور عزم واستقلال کا منظر پیش کیا اس سے شیخ الہندؒ کے اس خیال کی کسی حد تک تصدیق ہوگئی جو انھوں نے جامعہ ملیہ کے سنگِ بنیاد کے موقع پر خطبہ صدارت میں ظاہر کیا تھا کہ میں مدرسے سے مایوس ہو کر تمہارے پاس آیا ہوں کہ شاید اب تم ہی ملت کے درد کا درماں بن سکو۔

لیکن اس موقع پر جو بات قابل غور تھی اور جس کی شدید کمی محسوس ہوئی، وہ یہ تھی کہ ایک طرف نوجوانان ملت نے مورچہ سنبھالا تھا، تو دوسری طرف ایسے لوگ سامنے آتے جو ان مظاہروں کو منظم ومتحد کرنے کی فکر کرتے، عالمی میڈیا کو متوجہ کرتے، سفارت کاری کا عمل کرتے، سفارت خانوں کو متوجہ کرتے، اپوزیشن کو متحد کرتے، اس کی فکر کرتے کہ جو تحریک آپ ہی آپ پیدا ہوئی، شعور وبیداری کی جو روشنی نظر آئی اس کو صبح روشن میں کیسے تبدیل کیا جائے، مگر افسوس صد افسوس مصلحتوں نے اجازت نہ دی بلکہ بہت سے لوگ خاموشی سے آگے بڑھ کر خود ان از حد ضروری کوششوں کی مخالفت پر اتر آئے، یہ الگ بات کہ ان کی مخالفت کا اثر نہ ہوا، ہنوز تحریک زور وشباب پر ہے، اپنا اثر بھی دکھا رہی ہے، ملک گیر بھی ہو رہی ہے اور مختلف

طبقات کے لوگ بھی شامل ہوتے جارہے ہیں، مگر یہ بات لوگوں کے سمجھنے کی تھی کہ بات صرف ایک بل کی مخالفت کی نہیں ہے، بلکہ بات فسطائیت کے خلاف لمبی جنگ کی ہے، بات صرف CAB کی نہیں ہے، بات یہ ہے کہ ہندتوا کا ایجنڈا رکھنے والے اس کے بعد قانون پر قانون بنا کر گھیرا تنگ کریں گے، ہم بہت پہلے لکھ چکے ہیں کہ بی جے پی نہ ہندو راشٹر کا اعلان کرے گی اور نہ آئین کو منسوخ کرے گی، وہ محض ترمیمات کے ذریعہ یہ دونوں کام کر گذرے گی، یکے بعد دیگرے وہ بڑی چالاکی اور تیزی کے ساتھ اسی جانب پیش قدمی کر رہی ہے، ان خطرات کے پیش نظر ضروری ہے کہ کچھ دل دردمند رکھنے والے بیدار مغز لوگ سامنے آئیں اور اس چنگاری کو ایسا شعلہ بنانے پر غور کریں جو فرقہ پرستوں کے غرور کو جلا کر رکھ دے، اس تحریک کو ایسی ملک گیر تحریک میں تبدیل کرنے پر غور کریں جو فرقہ پرست عناصر کے لیے دہائیوں تک عبرت کا کام کرے، ضرورت ہے کہ وقت گذر جانے اور موقع نکل جانے سے قبل اپنی تنگنائیوں سے باہر نکل کر فکر کر لی جائے، ضرورت ہے کہ ایک طرف غیر مسلموں سے رابطے کی فکر کی جائے، اسلام کی صحیح تصویر پیش کرنے پر توجہ دی جائے، دوسری طرف اپوزیشن کو متحد کرنے پر غور کیا جائے، اس بل کے بائیکاٹ اور تحریک عدم تعاون کے لیے اپوزیشن سے اعلان کرایا جائے، داخلی و خارجی رابطے پر محنت کی جائے، ضرورت ہے کہ اس تحریک کو مزید مضبوط کر کے ای وی ایم کی منسوخی کے لیے محنت کی جائے، کیونکہ میرا یقین ہے کہ جب تک ای وی ایم ہے تب تک آئے دن اس طرح کے مسائل سے جوجھنا پڑے گا، ضرورت ہے کہ ان ہی جیالوں میں سے نئی، موثر، متحرک و فعال قیادت تیار کی جائے، عمر دراز بزرگ اپنی سرپرستی میں نئی نسل کو آگے بڑھانے اور تیار کرنے کا اپنا فرض منصبی دیانت داری کے ساتھ انجام دیں، اگر آج آواز نہ اٹھائی گئی تو وہ دن دور نہیں جب روہنگیا اور اویغور مسلمانوں کی طرح ہمارے آنسو پونچھنے والا بھی کوئی نہ میسر ہوگا۔

یاد رکھیے! خوب یاد رکھیے اگر اس وقت یہ تحریک ناکام ہوگئی، یہ مظاہرے مصلحت وانانیت اور ناعاقبت اندیشی کی بھینٹ چڑھ کر بے نتیجہ ختم ہوگئے تو فرقہ پرست مزید مغرور و طاقت ور بن جائیں گے اور پوری آزادی کے ساتھ دندنائیں گے، آئین کی دھجیاں اڑاتے ہوئے ہمارے بنیادی حقوق چھیننے سے ان کو کوئی نہ روک سکے گا، اگر اس وقت شعور کی بیداری سے فائدہ نہ اٹھایا گیا اس کا رخ صحیح سمت میں نہ موڑا گیا، اس کو منظم کرنے اور نتیجہ خیز بنانے کی فکر نہ کی گئی اور انقلاب کی یہ آندھی بھی یوں ہی گذر گئی، یہ تحریک بھی اگر ہماری بے جا بحثوں، آپسی نا اتفاقیوں، چپقلشوں اور مصلحتوں یا روٹیاں سینکنے کی بدترین عادت کی بھینٹ چڑھ گئی تو پھر کئی دہائیوں تک ماتم کرنے اور گنگنانے کے لیے بس یہی رہ جائے گا کہ ؎

آندھیو! جاؤ اب کرو آرام
ہم خود اپنا دیا بجھا بیٹھے

☆☆☆

❑ پیامِ سیرت

کیا اِن حالات میں ہمارے ایمان میں اضافہ ہوا؟

محمد فرید حبیب ندوی

جنگ احد میں مسلمانوں کو شکست وہزیمت کا سامنا کرنا پڑا۔ستر مسلمان شہید ہوئے اور اتنے ہی قید ہوئے۔سب سے حوصلہ شکن پہلو یہ رہا کہ کفار نے حضورﷺ کی وفات کی افواہ پھیلا دی،جس سے بہت سے مسلمان شکستہ خاطر ہوکر بیٹھ گیے۔بعد میں یہ خبر غلط ثابت ہوئی۔اس موقعے پر رسول پاکﷺ کو سخت چوٹیں آئیں اورآپ بری طرح زخمی ہوئے۔ان حالات کا فطری نتیجہ تھا کہ مسلمانوں میں سخت مایوسی وناامیدی پیدا ہو۔اور وہ حالات کی سنگینی سے اور بھی زیادہ ڈرنے اور سہمنے لگیں۔بلکہ اسی موقعے پر لوگوں نے انھیں مشرکین سے ڈرانے کی کوشش بھی کی اور اس طرح کی باتیں کہیں کہ ''لوگ تمھارے لیے جمع ہوگیے ہیں۔تم ان سے ڈرو''۔لیکن قرآن نے اس موقعے پر صحابہ کے اندرون کی جو تصویر کشی کی ہے،وہ ملک کے موجودہ حالات میں ہمارے لیے بڑی اہمیت رکھتی ہے۔جب لوگوں نے صحابہ کرام کو طرح طرح کی باتیں بنا کر ڈرانے کی کوشش کی تو قرآن کہتا ہے کہ ''اس چیز نے ان کے ایمان میں اضافہ کردیا اور وہ کہنے لگے کہ ہمارے لیے اللہ کافی ہے اور وہ بہترین کارساز ہے''۔

سچی بات یہی ہے کہ جب حالات سخت سے سخت ہوجائیں۔جب دشمن ڈرانے کی کوششیں کرے۔جب ہر طرف سے گھیرا تنگ کیا جانے لگے۔جب نگاہیں پتھرا جائیں اور کلیجے منہ کو آجائیں۔جب صورت حال یہ ہو کہ ہر وقت یہ کھٹکا لگا رہے کہ کہیں دشمن اچک نہ لے،تو سچے ایمان والوں کا حال یہ ہوتا ہے کہ ان کا ایمان بڑھ جاتا ہے۔یہ نہیں کہ وہ ڈرنے اور کپکپانے لگیں۔وہ سہم جائیں اور مایوس ہوجائیں۔اور نہ یہ کہ ان کے ایمان میں کوئی ہلچل نہ ہو۔وہ ایک جگہ پر جامد رہے؛ بلکہ ہونا یہ چاہیے کہ ایمان بڑھ جائے،یقین میں اضافہ ہوجائے اور حالات دیکھ کر دل برداشتہ ہونے کی بجائے شہادت کی آرزو کی جانے لگے اور راہِ خدا میں جان دینے کو سعادت سمجھا جانے لگے۔

ملک کے موجودہ حالات میں جب ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا ہے اور مستقبل،حال سے بھی تاریک تر نظر آرہا ہے،اہل ایمان کو اپنے ایمان میں اضافہ محسوس ہونا چاہیے۔اس لیے کہ حق کے ساتھ حالات ہمیشہ رہے ہیں۔قرآن میں انبیا کے جو واقعات بیان کیے گیے ہیں،ان کا مطالعہ اس حقیقت سے واقف کراتا ہے کہ کسی بھی دور میں ایسا نہ ہوا کہ اہل حق کو ڈرایا نہ گیا ہو،ہراساں

نہ کیا گیا ہو اور انھیں ان کے وطن سے نکالنے اور بے گھر کرنے کی دھمکیاں نہ دی گئی ہوں۔انھیں قید و بند کی اذیتوں سے گزارا نہ گیا ہو۔حضرت شعیبؑ سے ان کی قوم کے لوگوں نے کہا:''اے شعیب !ہم تمھیں اور تمھارے مومن ساتھیوں کو اپنی بستی (اپنے ملک) سے نکال دیں گے، یا یہ کہ تم ہماری ملت (ہمارے مذہب) میں واپس آجاؤ (اور گھر واپسی کرلو)۔

یہ صورت حال تقریباً ہر نبی کے ساتھ رہی۔ حضرت ابراہیمؑ کو ان کے والد نے یہی دھمکی دی۔حضرت لوطؑ کو ان کی قوم نے اسی طرح کی وعیدیں سنائیں۔خود حضور ﷺ کے ساتھ یہی معاملہ کیا گیا۔جب یہ حقیقت ہے جو ہر دور میں دوہرائی گئی اور ہر نبی کے ساتھ پیش آئی،تو اگر ہمارے سامنے بھی یہی سب کچھ ہو رہا ہے تو خوف وگھبراہٹ کیوں؟ مایوسی و ناامیدی کس لیے؟

یقیناً برے حالات کو دور کرنے کی کوشش ہونی چاہیے۔اللہ پاک سے عافیت مانگنی چاہیے؛لیکن ذہنی طور پر خود کو اتنا مضبوط کرنے کی ضرورت ہے کہ خطرناک سے خطرناک حالات میں بھی دل کی کشتی ڈوبنے نہ پائے۔ایسا نہیں ہے کہ حالات آکر گزر جائیں گے اور دوبارہ پھر ایسے حالات پیش نہیں آئیں گے۔بلکہ ہونا یہ ہے کہ ایسے حالات بار بار پیش آئیں گے۔ہوسکتا ہے کہ کچھ عرصے کے لیے اطمینان کی فضا قائم ہوجائے؛لیکن پھر یہی ہوگا اور پھر سے دورِ آزمائش آئے گا۔حق ہے تو اس کے ساتھ کشمکش تو رہے گی۔حق کو ہمیشہ سکون میں سانس لینے اور اطمینان کی فضا میں بڑھنے کا موقع نہیں دیا جاتا۔حق کو تو خارزار سے گزرنا ہوتا ہے۔تو پھر جب ہم حق کے ساتھ ہیں اور حق ہمارے ساتھ ہے،تو یہ ناامیدی کیسی اور یہ خوف کیوں کر؟

ایک جگہ قرآن میں فرمایا گیا ہے:

''کیا لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ صرف ان کے یہ کہہ دینے سے کہ ہم ایمان لے آئے ہیں،انھیں چھوڑ دیا جائے گا اور انھیں آزمایا نہیں جائے گا؟ (کیوں نہیں) م نے تو ان سے پچھلے لوگوں کو بھی آزمایا تھا (اور اِن کو بھی آزمائیں گے)۔(عنکبوت:۱-۲)

یہ حالات آزمائش اور امتحان کے ہیں، کچے اور پکے مومنوں کی جانچ کی جارہی ہے، دیکھا جارہا ہے کہ کون گھبرا کر ایمان چھوڑ بیٹھتا ہے اور کون جما رہتا ہے، ان حالات میں جہاں حالات کی اصلاح کی کوشش ہو اور مستقبل کی بہتری کے لیے تیاری کی جائے،وہیں ذہنی رویوں کی اصلاح پر بھی توجہ دی جائے۔یہ بات سمجھائی جائے کہ زندگی جینے کا مزہ تو ایسے ہی حالات میں ہے۔ان حالات میں ایمان میں اضافہ ہونا چاہیے اور رسول پاک ﷺ کی باتوں پر یقین مزید بڑھ جانا چاہیے۔یہ ہمارے ایمان کی کسوٹی ہے۔ہم میں سے ہر ایک کو اس کسوٹی پر اپنے ایمان کو جانچنے کی ضرورت ہے۔سیرت سے ہمیں یہی سبق ملتا ہے اور ہر نبی کی زندگی کا یہی پیغام ہے۔خدا کرے کہ ہمارا ایمان مضبوط سے مضبوط تر ہوجائے اور جب ہر طرف سے ہمیں ڈرایا اور دھمکایا جارہا ہے تو ہماری زبانوں پر بھی یہ ورد جاری ہو:''حسبنا الله ونعم الوكيل''۔

☆☆☆

❑ مطالعۂ افکار

مولانا ابوالاعلی مودودیؒ - متکلم اسلام

پروفیسر محسن عثمانی ندوی

مولانا ابو الاعلی مودودیؒ زندگی بھر اسلام کے دفاع کے لیے سینہ سپر رہے۔قلم مولانا کے ہاتھ میں ایک تیغ جوہر دار تھا جو گذشتہ صدی میں باطل نظریات کے خلاف مسلسل چلتا رہا،انھوں نے اپنے قلم سے تلوار کا کام لیا اور اتنا بڑا کام انجام دیا کہ اس کی نظیر آسانی سے نہیں ملتی ۔ وہ خود سپاہی تھے، اور خود سپہ سالار اور خود ایک لشکر جرار ، نصف صدی تک مسلسل مغرب سے درآمد کیے ہوئے نظریات کا مقابلہ کرتے رہے،مسلمانوں کی نئی نسلوں میں انھوں نے اسلام کا اعتماد بحال کیا،اوران کو احساس کمتری سے نکال دیا، آج ساری دنیامیں جہاں جہاں اسلام کے غلبے اور نشأۃ ثانیہ کی کوششیں ہورہیں ہیں ان کی تہہ میں کہیں نہ کہیں مولانا ابوالاعلی مودودی کا قلم بھی کارفرما ہے، بلکہ اس میں مولانا مودودی کے قلم کا بہت بڑا حصہ نظر آئے گا۔

مولانا کا بہت بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے نئی نسل کے دلوں میں اسلام سے محبت پیدا کی،اوراسلام کے سر بلندی کے جذبہ کو سینوں میں بیدار کیا اور اس نسل کو جو اشتراکیت یا الحاد کی گود میں گرنے والی تھی،ان کے دلوں میں اسلام سے محبت پیدا کی۔مولانا مودودی کو یہ کامیابی اس لیے حاصل ہوئی کہ انہوں نے قدیم طرز کے علماء کے برخلاف دور جدید کے نظریات کا گہرا مطالعہ کیا۔ان کی واقفیت صرف دینی علوم پر محدود نہ تھی بلکہ جدید اور نئی دنیا کے افکار سے بھی وہ واقف تھے،مغربی تہذیب اوراس کی کمزوریوں کا انہیں علم تھا، اور انھیں اس بات کا پورا یقین تھا کہ مغربی تہذیب کا سفینہ موجوں کی تاب نہیں رکھتا ہے، اوراس میں یہ صلاحیت نہیں ہے کہ انسانیت کے اس قافلے کو ساحل مراد تک پہونچا سکے، مغربی تہذیب پر تنقید کے معاملے میں اگر کوئی شخصیت پورے عالم اسلام میں ان کے ہم رتبہ ہوسکتی تھی تو وہ علامہ اقبالؒ کی تھی جنھوں نے اپنی شاعری میں مغربی تہذیب پر شدید تنقیدیں کی تھیں، مولانا مودودی کی کتاب ''تنقیحات'' کا مطالعہ کیجیے اس کے بیش تر مضامین میں مغربی تہذیب کے کھوکھلے پن کو ادب وانشاء کے بہترین پیرایہ بیان میں پیش کیا گیا ہےاوران اہل قلم کے مضامین پر فکر انگیز تنقید کی گئی ہے جوعقیدۂ اسلام کے بارے میں شک پیدا کرتے ہیں،اورالحاد کی تبلیغ کیا کرتے ہیں۔ان کی کتاب ''رسالہ دینیات'' کو پڑھیئے یہ اگر چہ طالب علموں اور بچوں کے لیے لکھی گئی ہے لیکن خوبصورت اور سادہ و پرکار نثر کا بہت اچھا نمونہ ہے، یہ اسلام کی گائیڈ بک اور رہنما کتاب ہے، ان کی کتاب ''خطبات'' میں اسلام کے ارکان اور بنیادی احکام اور

اصولوں کی دلآویز اور دلنشین تشریح کی گئی ہے۔

مولانا ابوالاعلی مودودی کے کاموں کی الگ الگ حیثیتیں ہیں، لیکن مولانا مودودی کا سب سے نمایاں کام وہ ہے جسے جدید علم کلام کہا جا سکتا ہے، جدید علم کلام میں مولانا مودودی کا کیا مقام ہے، اگر اسے سمجھنا ہو تو ان کی کتاب پردہ، الجہاد فی الاسلام، اسلام میں قتل مرتد کی سزا، اسلام اور ضبط ولادت، سود، اسلام اور جدید معاشی نظریے، قادیانیت اور ترجمان القرآن کے منصب رسالت نمبر کا مطالعہ کیجیے، پردے کی حمایت میں دنیا میں کسی بھی زبان میں لکھی ہوئی کتابوں میں سب سے طاقتور کتاب مولانا مودودی کی ہے۔ بیسویں صدی کی بالکل ابتداء میں مصر کے ایک مشہور صاحب قلم قاسم امین نے عورت کی آزادی (تحریر المرأۃ) کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی، مولانا مودودی کا عنفوان شباب تھا وہ ان سے متأثر ہوئے اور انہوں نے اس کا ترجمہ کر دیا، اور پھر کتاب شائع ہوگئی، بعد میں جب انہوں نے دینی علوم میں دست گاہ حاصل کی تو انہیں اس کا بڑا قلق ہوا اور انہوں نے اس کا کفارہ پردے کی حمایت میں ایک مستقل تصنیف تیار کر کے کیا۔ الجہاد فی الاسلام مولانا مودودی کی پہلی تصنیف ہے جو شروع میں دار المصنفین اعظم گڑھ سے شائع ہوئی تھی، دار المصنفین کے اس وقت سربراہ مولانا سید سلیمان ندوی تھے۔ جہاد وہ موضوع ہے جو مستشرقین اور یورپ کے علماء کے طنز وتنقید کا ایک زمانۂ دراز تک ہدف رہا ہے، اور انہوں نے اسلام کی ایک غلط تصویر پیش کی ہے، کہ یہ قتل وغارت گری کا مذہب ہے، اور اسلام کی تاریخ کے بارے میں مستشرقین کا نظریہ یہ ہے کہ ''بوئے خوں آتی ہے اس قوم کے افسانے سے''، یورپ کے اس اعتراض کے جواب میں مسلمان علما اور اہل قلم ہمیشہ دفاعی پوزیشن اختیار کرتے رہے، اور یہ کہتے رہے کہ تلوار کا اسلام میں کوئی حصہ نہیں ہے۔ مولانا مودودی نے پہلی مرتبہ دفاعی پوزیشن کے بجائے اقدام کا موقف اختیار کیا اور انہوں نے ''مصلحانہ جنگ'' کی ایک نئی تعبیر اسلامی لٹریچر کو عطا کی، اسلامی جنگوں کے اعلی مقاصد کا یورپ کی جنگوں اور ان کے اسباب ومحرکات سے موازنہ کیا۔ اسلام میں ارتداد کی سزا وہ موضوع ہے جس پر یورپ کے نام نہاد دانشوروں کو اعتراض ہے، مولانا نے اس امر کی اتنی اچھی تنقیح کی ہے کہ اس سے بہتر شاید ممکن نہیں۔ سود کا مطالعہ کیجیے تو معلوم ہوگا کہ معاشیات پر جو دور جدید کی ایک سائنس ہے مولانا کی نظر کتنی گہری ہے، کسی بھی شخص کا اسلامی نظام معیشت کا مطالعہ مکمل اور اپ ٹو ڈیٹ نہیں کہلائے گا اگر اس نے 'سود' اور ''اسلام اور جدید معاشی نظام'' کا مطالعہ نہ کیا ہو، مولانا کی پردہ اور سود دونوں کتابیں عرب دنیا میں بہت مقبول ہو چکی ہیں، ان دونوں کا ترجمہ مولانا مسعود عالم ندوی نے کیا تھا، جو عربی زبان کے بہت بڑے انشا پرداز تھے۔ بعض علماء نے دار الحرب میں اور ہندوستان میں سود کے جواز کا فتوی دیا تھا، مولانا مناظر حسن گیلانی کا بھی اس سلسلہ میں ایک مضمون شائع ہوا تھا، مولانا مودودی نے اس مضمون کا جواب دیا تھا اور اس پر گہری تنقید کی تھی، مولانا مودودی کا یہ مضمون بھی کتاب کا جزء بن گیا ہے، پروویڈنٹ فنڈ اور لائف انشورنس کے مسائل بھی اس کتاب میں آگئے ہیں۔

مولانا مودودی کے علم کلام کے سلسلہ کی کتابوں میں ''اسلام اور ضبط ولادت'' کو بھی بڑی اہمیت حاصل ہے، ضبط ولادت کی تحریک کی مخالفت میں بہت سے علماء نے کتابیں لکھی ہیں، ان سب کو سامنے رکھئے اور مولانا مودودی کی کتاب کو سامنے رکھیے، اس تقابلی مطالعے سے آپ کو مولانا مودودی کے وسعت مطالعہ اور دقت نظر اور قوت استدلال کا اندازہ ہوگا۔

مولانا مودودی نے صرف دور جدید کی پیدا کردہ فکری گمراہیوں کا مقابلہ نہیں کیا، بلکہ اندرون ملک اور برصغیر ہندوستان اور پاکستان کے داخلی فتنوں اور کج فکریوں کی روک تھام کی کوشش کی، قادیانیت کا فتنہ انہی داخلی فتنوں میں سے ایک فتنہ ہے، مولانا نے اس فتنہ کا جال ہتھیلی پر رکھ کر مقابلہ کیا اور قادیانیت کے رد میں وہ رسالہ لکھا جس پر حکومت وقت نے انہیں پھانسی کی سزا دی تھی، گویا دین اسلام کے خلاف اس سازش کا مقابلہ کرتے ہوئے وہ دار ورسن کی آزمائش کو بھی قبول کرنے کے لیے تیار ہو گئے، پاکستانی حکومت کے اس فیصلے کے خلاف پورے عالم اسلام سے احتجاج بلند ہوا اور حکومت کو اپنا فیصلہ واپس لینا پڑا۔ داخلی فتنوں کی دوسری مثال انکار حدیث کا فتنہ ہے یوں تو اس فتنہ پر بعض چیزیں مولانا مودودی کے قلم سے پہلے شائع ہو چکی تھیں، جو ان کی کتاب تفہیمات میں شامل ہیں، لیکن اس موضوع پر ان کی باضابطہ اور معرکہ آرا چیز ترجمان القرآن کا رسالت نمبر ہے، یہ کتاب دراصل غلام احمد پرویز کے ایک دست راست اور انکار حدیث کے مبلغ کی مولانا مودودی سے خط وکتابت کا مجموعہ ہے اور اس کی تحریروں کا جواب ہے، بعد میں منصب رسالت نمبر ایک الگ کتاب کی شکل میں شائع ہوا جس کا نام ہے ''سنت کی آئینی حیثیت''۔

مولانا مودودی صاحب اس عہد کے ان جلیل القدر علماء میں تھے جنھوں نے اسلام کو دلوں اور دماغوں میں اتارنے کے لیے نئی زبان واسلوب کو ضرور اختیار کیا لیکن مسلک میں علماء سلف کے خیالات سے بالعموم انحراف نہیں کیا، پردے کا مسئلہ ہو یا سود کا، تصویر کا مسئلہ ہو یا ضبط ولادت کا، مولانا مودودی کے خیالات وہی ہیں جو قدیم علماء کے تھے، لیکن اس کے باوجود مولانا مودودی اور ان کی جماعت کے بارے میں ایک مخصوص مکتبہ فکر کے لوگوں نے وہ موقف اختیار کیا جو کسی بھی اعتبار سے عدل وانصاف اور شرافت اور شائستگی کے معیار کے مطابق نہیں تھا، مولانا کے خیالات سے اختلاف کیا جا سکتا ہے اور تنقید میں قلم بھی اٹھایا جا سکتا ہے لیکن ایک خادم دین کو ہادم دین قرار دینا اور اس کی دینی خدمات کا اعتراف نہ کرنا صراحتاً ظلم ہے۔ مولانا مودودی نے اسلام کے خدمت گزاروں کی ایک بڑی جماعت پیدا کر دی اور ایک ذہن بنا دیا جو اس وقت پوری دنیائے اسلام میں اپنا کام کر رہا ہے، اور ہر جگہ غلط نظریات اور مسموم خیالات کا مقابلہ کر رہا ہے، یہ کوششیں جہاں جہاں ہوں گی اور جتنے زمانے تک جاری رہیں گی، مولانا مودودی کے لیے انشاء اللہ صدقہ جاریہ کے حکم میں ہوں گی۔

کسی بھی شخصیت کے دینی مقام کے تعین کرنے میں بالعموم افراط وتفریط سے کام لیا جاتا ہے، اور لوگ انصاف کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیتے ہیں، اصل یہ ہے کہ دین کا تصور جس قدر متوازن ہوگا اتنی ہی متوازن رائے کسی شخص کی دینی خدمات کے بارے میں ہوگی، دین دراصل عبادت اور خلافت کے مجموعے کا نام ہے، قرآن کی آیت ہے وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون اور دوسری آیت ہے انی جاعل فی الارض خلیفة ان دونوں آیتوں کو ملانے سے دین کا جامع تصور پیدا ہوتا ہے۔ جن شخصیتوں نے ان دونوں میدانوں میں بہتر خدمات انجام دیں یعنی ان کا تعلق عبادات اور روحانیت سے بھی رہا اور مسلمانوں کی اجتماعی زندگی اور غلبہ اسلام کے کاموں سے بھی رہا، وہ شخصیتیں اسلام کے نقطۂ نظر سے زیادہ معتبر اور مؤقر ہیں، اور دین کے صحیح تصور کے نہ پائے جانے کی صورت میں شخصیات کے بارے میں تبصرے عام طور سے غیر مناسب اور غیر متوازن ہو جاتے ہیں۔

☆☆☆

❑ نقد و نظر

غامدی فکر کی بنیادی گمراہی

مولانا یحییٰ نعمانی

گزشتہ تقریباً بیس سال سے جناب جاوید احمد غامدی صاحب کے افکار کا ذرائع ابلاغ میں چرچا خاصا سرگرمی سے جاری ہے۔ یہ عاجز ان کی چیزیں اس وقت سے پڑھتا اور دیکھتا آیا ہے جب غالباً انڈیا میں ان کو معدودے چند لوگ جانتے تھے۔ ان کا رسالہ اشراق الفرقان میں آتا تھا۔ اور کم از کم ۱۹۸۹ء سے ۲۰۰۸ء تک نظر سے گزرتا رہا۔ وہ اپنی نسبت محترم مولانا امین احسن اصلاحی مرحوم کی طرف کرتے ہیں، میں ان کی چیزیں پڑھ کر محسوس کرتا تھا کہ مولانا مرحوم نے حد رجم کے سلسلے میں جس خطرناک جرأت اور شذوذ پر انتہا کی ہے، جناب غامدی صاحب نے وہاں سے اپنا آغاز کیا ہے۔

پھر انٹرنیٹ نے ان کے افکار کی تبلیغ کا دائرہ بہت وسیع کر دیا۔ اِدھر کچھ عرصے سے ملک کے مختلف علاقوں میں لوگ مجھ سے ان کے بارے میں پوچھا کرتے تھے اور یہ بھی معلوم ہوتا تھا کہ ان کے لیکچرز سے کچھ لوگ ہمارے یہاں بھی متأثر ہونے لگے ہیں۔

مغربی تہذیب کے بین الاقوامی غلبے اور پھیلاؤ کی وجہ سے مسلمانوں میں ہر جگہ کا ایک ایسا طبقہ وجود میں آ گیا ہے، جس کو اپنے مسلمان ہونے کے باوجود، اپنے خاص ماحول کے زیر اثر علماء اور اہل دین سے ایک نفسیاتی الجھن اور ذہنی دوری ہے۔ ایسے لوگ ہر گمراہ کن تحریک و دعوت کے سب سے جلد شکار ہو جاتے ہیں۔ تجربہ ہو رہا ہے کہ یہی طبقہ جناب غامدی صاحب سے متأثر ہو رہا ہے۔

میں سوچتا تھا کہ انٹرنیٹ کے ذریعے ہر متعدی مرض وبا کی طرح پھیلتا ہے، یہ بھی اسی طرح پھیل رہا ہے، لیکن ابھی مورخہ ۱۳/اپریل ۲۰۱۹ء کو معلوم ہوا کہ ان کے ادارے المورد کی بھارتی شاخ قائم ہو چکی ہے۔ جہاں سے ان کی کتابیں، رسائل اور ویڈیو لیکچرز وغیرہ کی نشر و اشاعت کا کام ہو رہا ہے۔

اب مجھے اپنی دینی ذمے داری محسوس ہوئی کہ ان کے فکر کی بنیادی گمراہی کو واضح طور پر پیش کیا جائے۔ تاکہ ان کی چیزیں سننے اور پڑھنے والا واقف ہو کہ:

اُن کے افکار کی اصل بنیاد کس غلط فکری پر ہے؟

اور ان کی آراء کیوں دین کی صحیح بنیادوں سے ہٹی ہوئی ہیں؟

جناب جاوید احمد غامدی صاحب کی گمراہی اور اہل سنت و اہل حق سے ان کا اصل انحراف کوئی معمولی قسم کا نہیں ہے۔ ان کے نزدیک بنیادی طور پر رسول اللہ ﷺ اس کے اہل و حق دار ہی نہیں کہ اُن کے ذریعے (قرآن کے علاوہ) دین کا کوئی عقیدہ یا عمل انسانوں کو دیا جائے۔ وہ منصب رسالت کا یہ

مقام تسلیم نہیں کرتے کہ وہ دین کا کوئی حکم قرآن کے علاوہ جاری کرے، سوائے اس کے کہ مشرکین مکہ اور یہود ونصاریٰ میں جو دینی روایت جاری چلی آرہی تھی، جناب غامدی صاحب کے نزدیک رسول اس کو اصلاح وتجدید کے ساتھ جاری کرسکتا تھا۔ بس اسی دائرے میں رسول کی حدیث وسنت کی اطاعت بطور دین ان کے نزدیک ضروری ہے۔ یعنی اللہ اپنے رسول کو اپنے بندوں کے لیے کوئی ایسا نیا اور مستقل حکم دے جو ملت ابراہیمی کے چلے آرہے طریقے کے علاوہ ہو اور وہ دین اسلام کا کسی درجے کا بھی حصہ قرار پائے یہ نبی ورسول کا منصب ومقام نہیں ہے۔

ان کا نظریہ ہے کہ حدیث کے ذریعے ''دین کا کوئی نیا حکم ثابت نہیں'' ہوتا۔ وہ واضح طور پر منکر حدیث ہیں۔ البتہ ان کے انکار حدیث کی نوعیت مشہور اور عام منکرین حدیث سے قدرے مختلف اور نسبۃً کم درجے کی ہے۔ ان کے فکر کی سب سے بنیادی کتاب ''میزان'' وہی ان کے تصور دین کا اصل صحیفہ ہے۔ اس میں انہوں نے بڑی صراحت کے ساتھ اور کسی اشتباہ کے بغیر صاف واضح کیا ہے کہ حدیث دین کا ماخذ ہے ہی نہیں۔ جناب غامدی صاحب تحریر فرماتے ہیں:

> نبی ﷺ کے قول وفعل اور تقریر وتصویب کی جو روایتیں زیادہ تر اخبار آحاد کے طریقے پر نقل ہوئی ہیں، اور جنہیں اصطلاح میں حدیث کہا جاتا ہے، ان کے بارے میں یہ بات تو بالکل واضح ہے کہ ان سے دین میں کسی عقیدہ وعمل کا کوئی اضافہ نہیں ہوتا''۔

کیا اس جملے میں کسی ایسی تاویل وتوجیہ کی کوئی گنجائش ہے جس کے ذریعے یہ کہا جاسکے کہ جناب غامدی صاحب منکر حدیث نہیں ہیں؟ اور پڑھیے اس جملے کے معاً بعد تحریر کرتے ہیں:

اس مضمون کی تمہید میں ہم نے پوری صراحت کے ساتھ بیان کردیا ہے کہ یہ چیز حدیث کے دائرے ہی میں نہیں آتی کہ وہ دین میں کسی نئے حکم کا ماخذ بن سکے'' (میزان، صفحہ:۶۱ ایڈیشن ۲۰۱۴ء)۔

کیا اب بھی کوئی اشتباہ باقی رہ جاتا ہے؟

ہاں یہاں ایک چیز غور کرنے لائق ضرور ہے۔ مندرجہ بالا عبارت میں جناب غامدی صاحب نے حدیث کے بارے میں یہ بات کہہ کر کہ حدیث کے ذخیرے کی زیادہ تر روایات اخبار آحاد ہیں، غالباً یہ تأثر دینے کی کوشش کی ہے کہ وہ حدیث کو جو دین میں حجت نہیں مانتے اس کا سبب ان کا خبر واحد ہونا ہے۔ اس طرح ان کے موقف کا شذوذ واجنبیت اور عام مسلمانوں کے لیے اس سے وحشت کم ہوجائے گی۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اس عبارت میں اخبار آحاد کا لاحقہ بس ایک ''شے ءِ زائد'' ہے۔ جناب غامدی صاحب کے یہاں متواتر حدیث سے بھی دین کا کوئی نیا عقیدہ یا عمل ثابت نہیں ہوتا۔ اوپر مذکور ان کی عبارت میں غور کیجیے:

> ''یہ چیز حدیث کے دائرے ہی میں نہیں آتی کہ وہ دین میں کسی نئے حکم کا ماخذ بن سکے''

یہاں غامدی نظریے کی ایک خاص بنیاد اور جان لیجیے۔ جس سے اوپر کی عبارتوں میں حدیث کے بارے میں ان کے الفاظ کہ اس سے ''عقیدہ وعمل کا کوئی اضافہ نہیں ہوتا'' اور یہ بات کہ حدیث ''دین میں کسی نئے حکم کا ماخذ'' نہیں بن سکتی، کا پورا مفہوم سمجھ میں آسکے۔

جناب غامدی صاحب نے اپنی اس کتاب میں، جو اُن کے فکر کی بنیاد ہے، بتایا ہے کہ، دین ہم تک دو صورتوں سے پہنچا ہے:

(۱) قرآن مجید (۲) سنت

دھوکہ نہ کھا جائیے گا! صحابہ سے لے کر آج تک مسلمان سنت سے جس حقیقت کو مراد لیتے ہیں اور جس کا نام لیتے ہی ذہن وتصور میں رسول اللہ ﷺ کی ذات سے ملنے والی احادیث واعمال کا خیال آتا ہے، غامدی صاحب کے یہاں سنت اس معنیٰ میں نہیں ہے۔ بلکہ یہ کچھ اور ہی تصور ہے۔

جناب غامدی صاحب فرماتے ہیں کہ:

سنت سے ہماری مراد دین ابراہیمی کی وہ روایت ہے'' (جو عرب کے مشرکین اور یہود ونصاریٰ میں چلی آرہی تھی)، ''جسے نبی ﷺ نے اس کی تجدید واصلاح کے بعد اور اس میں بعض اضافوں کے ساتھ اپنے ماننے والوں میں جاری کیا(۱)''۔(میزان صفحہ:۱۴)

اسی مقام پر غامدی صاحب کہتے ہیں کہ دین کے ماخذ بس یہی دو ہیں اور کچھ نہیں۔فرماتے ہیں:

دین لاریب، انہی دو صورتوں میں ہے۔ ان کے علاوہ کوئی چیز دین ہے، نہ اسے دین قرار دیا جاسکتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے قول وفعل اور تقریر وتصویب کے اخبار آحاد جنہیں بالعموم ''حدیث'' کہا جاتا ہے، ان کے بارے میں یہ حقیقت ناقابل تردید ہے کہ ان کی تبلیغ وحفاظت کے لیے آپ نے کبھی کوئی اہتمام نہیں کیا، بلکہ سننے اور دیکھنے والوں کے لیے چھوڑ دیا ہے کہ چاہیں تو انہیں آگے پہنچائیں اور چاہیں تو نہ پہنچائیں، اس لیے دین میں ان سے کسی عقیدہ وعمل کا اضافہ بھی نہیں ہوتا۔ (صفحہ:۱۵)

جناب غامدی صاحب کی بنیادی گمراہی انکار حدیث ہے۔ وہ ایک نئے طرز کے منکر حدیث ہیں۔ مجھے بڑا قلبی قلق رہا کہ جس وضاحت کے ساتھ اور متعین ودوٹوک (Pin Point) نشان دہی کے ساتھ ان کی یہ گمراہی عوام کے سامنے آنی چاہیے تھی نہیں آئی۔

جناب غامدی صاحب صرف انکار حدیث کے اس نظریے کا اظہار ہی نہیں کرتے بلکہ اس کی عملی تطبیق بھی اس طرح کرتے ہیں کہ، رسول اللہ ﷺ کے بیان کیے ہوئے وہ تمام حقائق وواقعات اور وہ تمام احکام جو قرآن میں نہیں ہیں، اور جن کو وہ ملت ابراہیمی کی پچھلی روایت میں بھی نہیں پاتے، ان کو صاف دین وشریعت کا حصہ ماننے سے انکار کردیتے ہیں۔ غامدی صاحب کے اس تصور دین کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ بعض ایسے عقائد کا بھی انکار کیا گیا جو متواتر احادیث سے ثابت ہیں اور جن کے انکار پر یقینی طور پر لازم آتا ہے کہ آدمی نے ایسی بات کو قبول کرنے سے انکار کردیا ہے جو محمد رسول اللہ نے یقینی اور قطعی طور پر بتلائی تھیں۔

اِس کی وجہ یہ ہے کہ جناب غامدی صاحب کہہ چکے ہیں کہ ملت ابراہیمی کی جو روایت رسول اللہ ﷺ نے دین کی حیثیت سے جاری فرمائی اس کا نام ''سنت'' ہے اور اس کا دائرہ صرف اور صرف اعمال کی حد تک ہے۔ عقیدہ کی کوئی قسم اس سے ثابت نہیں ہوسکتی (میزان صفحہ: ۵۸)۔ ان کے نزدیک حدیث اِس سنت کے علاوہ ہے۔ اور جیسا کہ اوپر گزر چکا ان کے نزدیک حدیث سے دین میں کوئی عقیدہ یا عمل ثابت نہیں ہوسکتا۔ یعنی رسول اللہ ﷺ نے جو باتیں آخرت، جنت جہنم اور دیگر عقائد کے سلسلے میں ارشاد فرمائیں اور عالم غیب کے جن بے شمار واقعات وحقائق کی خبر دی، چاہے ان کی روایت متواتر ومشہور اور صحیح ہی کیوں نہ ہو، ان سے دین اور اس کا کوئی عقیدہ ثابت نہیں ہوتا۔ ان کے نزدیک یہ چیز حدیث کے دائرے ہی میں نہیں آتی کہ وہ دین کے کسی عقیدے یا حکم کا ماخذ بن سکے۔

ناظرین کرام غور فرمائیں کہ اس کا مطلب کیا ہوا؟ آپ ﷺ ساری زندگی اپنی مجلسوں میں جو گفتگو فرماتے رہے، اور عالم غیب کی جو تفصیلی خبریں دیتے رہے اگر ان کا دین سے کوئی تعلق (بقول جناب غامدی صاحب) نہیں ہے، تو کیا وہ سب فضول اور بے مطلب باتیں تھیں؟۔

مجھے پاکستان کے بعض ان جلیل القدر علماء پر شدید حیرت ہے، جنہوں نے اس جیسی گمراہی اور کج فکری کی تردید میں بڑی لمبی چوڑی علمی گفتگو کر کے جناب غامدی صاحب کو کسی سنجیدہ علمی گفتگو کا مستحق سمجھا؟ اور ان کے ان نامعقول افکار پر فلسفیانہ گفتگوئیں کیں۔

اب غور فرمایئے وہ تمام احادیث جن میں مثلاً پل صراط اور حضرت مسیح علیہ السلام کے نزول وغیرہ کی خبر دی ہے، غامدی اصول دین میں ان میں سے کسی پر دینی عقیدہ اور یقین رکھنا غلط ہے، اس لیے کہ حدیث کی یہ ''مجال'' ہی نہیں کہ وہ ہمیں کوئی عقیدہ دے سکے۔ واضح رہے کہ یہ وہ حقائق اور اخبار ہیں جن کی حدیثیں متواتر طور پر رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہیں، یعنی صحابہ سے لے کر بعد کی نسلوں تک ہر زمانے میں اس کو آپ ﷺ سے نقل کرنے والے اتنے لوگ رہے ہیں کہ ان کا کسی کذب بیانی یا غلط فہمی پر متفق ہونا عقلاً محال اور ناممکن ہے۔ اور یہ قطعی طور پر ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ان چیزوں کی خبر دی ہے اور اپنی امت کو ان کے بارے میں بتلایا ہے۔

ایسی چیزوں کو علماء کی اصطلاح میں ضروریات دین کہتے ہیں۔ یعنی وہ باتیں جن کے بارے میں بدیہی یقین کے درجے میں یہ بات ثابت ہے کہ ان کو رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے اور ان کی بابت اپنی امت کو تعلیم دی ہے۔

علماء امت کا اجماع واتفاق ہے کہ ان ضروریات دین میں سے کسی ایک بات کا انکار کرنے سے آدمی کافر ہو جاتا ہے۔ علم کلام واصول اور دیگر اسلامی علوم کی کتابوں میں اس مسئلے کو پوری وضاحت سے بیان کیا گیا ہے۔ آخر دور میں حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ نے اپنی معرکۃ الآراء تصنیف اکفار الملحدین میں اس سلسلے میں عقل صریح کی روشنی میں اور علماء امت اور سلف کی بے شمار تصریحات جمع کر کے ہر صاحب فہم کے لیے مسئلے کو بے غبار کر دیا ہے۔

یقیناً رسول اللہ ﷺ کے وہ ارشادات، جن کو ہر نسل میں اور ہر دور میں اتنے بہت سے لوگ نقل کرتے آئے ہوں، جن کے جھوٹ پر متفق ہونے اور سازش کرنے کی بھی گنجائش نہ ہو اور نہ یہ ممکن ہو کہ اتنے بہت سے لوگوں نے بات سمجھنے اور نقل کرنے میں غلطی کی ہو، تو پھر ایسے ارشادات کو تسلیم نہ کرنا اور ان کے خلاف عقیدہ وفکر رکھنا سوائے اس کے کچھ نہیں کہ خدا کے رسول کی تکذیب وتغلیط کی گئی ہے۔ ''ربنا آمنا بما انزلت واتبعنا الرسول فاکتبنا مع الشاهدين''۔

اپنے اسی اصول کی وجہ سے جناب غامدی صاحب حضرت عیسیٰ کی حیات اور نزول ثانی کے منکر ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ کی وفات ہو چکی۔ اب نہ وہ زندہ ہیں نہ قیامت سے قبل دوبارہ تشریف لائیں گے۔ (میزان ۱۷۸)

حالاں کہ رسول اللہ ﷺ نے ان کی حیات اور قیامت سے پہلے دوبارہ دنیا میں تشریف لانے کے بارے میں یقیناً خبر دی ہے اور پوری صراحت کے ساتھ دی ہے۔ اور آپ سے اس کی روایات متواتر ہیں، یعنی اتنے بہت سے راویوں نے ہر دور میں بیان کی ہیں جن کے غلطی کرنے کا امکان بھی نہیں ہے۔ حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ کی کتاب ''التصريح بما تواتر في نزول المسيح'' میں ان روایات کو جمع کر دیا گیا ہے، جس کے بعد اس میں شبہہ نہیں رہتا کہ رسول اللہ ﷺ نے یقیناً حضرت مسیحؑ کے قبلِ قیامت دنیا میں تشریف لانے اور

عظیم کارنامے انجام دینے کی خبر دی تھی۔ مگر غامدی صاحب کے یہاں اس کا دین سے کوئی تعلق نہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ کی وفات ہو چکی ہے۔ اور ان کے دنیا میں دوبارہ تشریف لانے کا عقیدہ بے حقیقت ہے۔ (میزان: ۱۷۸-۱۸۰)۔ اگرچہ یقیناً رسول اللہ ﷺ نے اس کی خبر دی ہے مگر ان کے نزدیک یہ چیز تو حدیث کے دائرے ہیں میں نہیں آتی ہے کہ اس سے دین میں کسی عقیدے یا عمل کا اضافہ ہو سکے۔

عقائد ہی کی طرح جناب غامدی صاحب کے دین میں رسول اللہ ﷺ کے دیے ہوئے ان احکام وقوانین کا کوئی درجہ نہیں ہے جن کی اصل نہ قرآن میں ہے اور نہ ''دین ابراہیمی کی روایت'' میں۔ ہم زیادہ تفصیل میں جانا نہیں چاہتے۔ اس لیے کہ انہوں نے اپنے فکر وتصور دین کا جو اصول پوری وضاحت اور قطعیت کے ساتھ بیان کر دیا ہے، اس سے خود بخود وہ تمام واجبات ومحرمات اور سنن ومستحبات دین کی فہرست سے خارج ہو جاتے ہیں جن کی اصل قرآن میں نہ ہو، اور جو دین ابراہیمی کی روایت کی حیثیت سے رائج نہ رہی ہوں۔ مثلاً بے شمار احکام ایسے ہیں جن کا کوئی ذکر قرآن میں نہیں آیا ہے اور نہ ان کا کوئی سراغ ''دین ابراہیمی کی روایت'' میں اس طور پر ملتا ہے کہ عرب یا یہود ونصاریٰ ان پر کاربند تھے۔ مثلاً سونے کے برتنوں میں کھانا پینا حرام ہے، مردوں کے لیے سونا اور ریشم کے لباس حرام ہیں، ڈاڑھی رکھنا اور بڑھانا واجب ہے، وغیرہ نہ جانے کتنے حلال وحرام کے احکام ہیں جو غامدی صاحب کے اصول کے ذریعے دین کا حصہ نہیں رہیں گے اور ''خارج از اسلام'' قرار پائیں گے۔ ان کے تصور دین اور فکری اصول کا لازمی تقاضہ یہی ہے۔

جناب غامدی صاحب کا حلقہ یہاں ایسے مقامات پر احادیث کی کچھ تاویل وتوجیہ، یا تضعیف، یا قرآنی آیات سے ان کے خلاف استدلال کی کچھ کوششیں کرتا ہے۔ مگر ان کو اس تکلف کی ضرورت ہی کیوں ہے؟ وہ مختصر یہ ہی کیوں نہیں کہہ دیتے کہ ہمارے عقیدے میں حدیث سے دین میں کسی عقیدے یا عمل کا اضافہ نہیں ہو سکتا اس لیے ہم ان باتوں کو نہیں مانتے۔ مگر عموماً وہ اور ان کے متبعین اپنا عقیدہ صاف کہنے کے بجائے پردہ داری سے کام لیتے ہیں۔ اسی پردہ داری کی وجہ سے ہم کو ان کے فکر کی اس بنیادی گمراہی کو کھولنا پڑ رہا ہے۔

چہ بے خبر ز مقام محمد عربیست:

غامدی تصور دین میں رسول اللہ ﷺ کا یہ منصب نہیں ہے کہ ان کے ذریعے، قرآن کے علاوہ اور یہود ونصاریٰ اور مشرکین عرب میں چلی آرہی دین ابراہیمی کی روایت کے علاوہ، کوئی نیا دینی حکم یا سنت ومستحب عمل دیا جائے۔ وہ اگر حدیث میں دیے گئے کسی حکم کو قبول کرتے ہیں یا رسول اللہ کے حرام قرار دیے گئے کسی فعل کو حرام مانتے ہیں تو بس اسی وقت جب مشرکین عرب اور یہود ونصاریٰ کی دینی روایت میں اس کی سند مل جائے۔ اسی لیے میزان میں جو ان کے فہم دین کا مکمل صحیفہ ہے، رسول اللہ ﷺ کے جو بھی احکام قبول کیے گئے ہیں ان کی سند بھی ذکر کی گئی ہے کہ بائبل میں اس کی اصل ملتی ہے یا عربوں کی جاہلیت میں اس پر عمل تھا۔

رسول اللہ ﷺ سے تواتر سے ثابت ہے کہ آپ نے مسواک کو دینی عمل قرار دیا اور اس کا اجر وثواب بیان فرمایا۔ جناب غامدی صاحب اس کو قبول کرتے ہیں مگر کیوں؟ میزان میں وہ بتاتے ہیں کہ اس لیے کہ جواد علی نے اپنی کتاب **المفصل فی تاریخ العرب قبل الاسلام** میں **المحبّر** کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ عرب جاہلیت کے دور میں مسواک کیا کرتے تھے (میزان: ۶۴۱)۔

لاحول ولاقوۃ الا باللہ۔ محمد رسول اللہ کے قول کو دین قرار پانے کے لیے ابولہب، ابوجہل اور بد مذہب پولس کی سند

کی ضرورت ہے!! **کبرت کلمة تخرج من افواههم**"۔

غامدی صاحب کا لٹریچر صاف بتاتا ہے کہ انہوں نے اگر کسی حدیث سے دین کا کوئی عمل ثابت کیا ہے تو اس تحقیق کے بعد ہی کہ جاہلی عہد کے عربوں اور یہود کی دینی روایت میں وہ چیز بطور دین رائج تھی یا نہیں۔ میزان میں جناب غامدی صاحب نے رسول اللہ ﷺ کے اس ارشاد کو دین تسلیم کیا ہے کہ جس کسی کا قربانی کا ارادہ ہو وہ ذی الحجہ کے شروع سے قربانی کرنے تک نہ بال کاٹے نہ ناخن (صحیح مسلم)۔ اس پر کسی نے سوال کیا کہ آپ نے اس حکم نبوی کو دین کیسے مان لیا؟ یہ تو آپ کے اصول کے خلاف ہے کہ کسی ایسی چیز کو دین مانا جائے جس کی اصل یہود ونصاریٰ یا مشرکین عرب میں چلی آرہی ملت ابراہیمی کی دینی روایت میں نہ ملتی ہو۔ اس کے جواب میں جناب غامدی صاحب کے رسالے (شمارہ نومبر ۲۰۱۸ء) میں بڑی تفصیلی تحریر شائع کی گئی، جس میں یہ بات تسلیم کرتے ہوئے کہ غامدی صاحب کا یہ اصول ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے ارشاد سے کوئی مستقل بالذات چیز اسی وقت دین کا حکم قرار پاسکتی ہے جب اس کی سند ملت ابراہیمی کی دینی روایت (یعنی عربوں کی ما قبل اسلام دینی روایت یا یہود ونصاریٰ کے یہاں) ملتی ہو۔ اس کے جواب میں ایک تفصیلی مقالے میں یہ دکھایا گیا کہ یہ چیز ملت ابراہیمی کی روایت میں موجود تھی، اور اس سلسلے میں بائبل کے بھی بہت سے حوالے دیے گئے۔ اور بالآخر یہ نتیجہ ثابت کیا گیا کہ غامدی اصول دین کے نقطۂ نظر کے مطابق رسول اللہ ﷺ کی حدیث کے اس حکم کو دین کا حصہ ماننا صحیح ہے۔

لہٰذا غامدی صاحب اور ان کے حلقے کی طرف سے جو یہ کہا جاتا ہے کہ وہ حدیث کو حجت مانتے ہیں، اور یہ کہ ان کی کتاب میزان اس اعلان سے شروع ہوتی ہے کہ دین کا واحد ماخذ محمد رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی ہے اور انہی کے قول وفعل اور تقریر وتصویب سے کوئی چیز دین قرار پاسکتی ہے، تو یہ بس ایک خاص قسم کی مغالطہ آرائی ہے۔ اس کے سوا کچھ نہیں۔ اس لیے کہ وہ ایسی باتوں کے وقت اپنے اس عقیدہ واصول کو چھپا لیتے ہیں کہ محمد رسول اللہ ﷺ کے کسی حکم کو دین کا مستقل بالذات حصہ ماننے کے لیے شرط ہے کہ وہ دین ابراہیمی کی تاریخی روایت کا حصہ ہو یعنی: اس کی تقریر وتصویب اہل کتاب یا مشرکین عرب کریں۔

ہماری جناب غامدی صاحب سے اصرار کے ساتھ اپیل ہے کہ اگر وہ اس خطرناک گمراہی کے قائل نہیں ہیں تو صاف طور پر کہیں کہ محمد رسول اللہ ﷺ کے ارشاد سے دین کے مستقل بالذات عقائد واحکام بھی ثابت ہو سکتے ہیں، اس کے لیے ملت ابراہیمی کی روایت کا حصہ ہونا شرط نہیں ہے۔ ورنہ ان کی کتاب اور ان کے رسالے کی سالوں کی تحریریں اسی فکر کی ناطق ہیں جو ہم نے اوپر پورے علمی امانت کے ساتھ نقل کی ہیں۔

عجب بات یہ ہے کہ حدیث کے ذریعے ہم کو ایسے بہت سے احکام ملے ہیں جن کا کوئی سراغ ملت ابراہیمی کی قدیم وموروث دینی روایت میں نہیں ملتا اور قرآن نے بھی ان کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے، مگر جناب غامدی صاحب ان کو تسلیم کرتے ہیں۔ وہ تسلیم کرتے ہیں کہ عیدین دین کا حصہ ہیں۔ کوئی ان سے پوچھے کیا عید الفطر اور عید الاضحیٰ کا رواج عہد نبوی میں ملت ابراہیمی کی روایت میں کہیں تھا؟ عرب کے مشرکانہ تہوار اور میلوں ٹھیلوں کو ختم کر کے حدیث نے ہم کو عیدین کے دینی تہوار دیے۔ یہ سب حدیث ہی سے ہم کو ملا ہے۔ پھر وہ عید کی نماز کو بھی لازم قرار دیتے ہیں۔ کیا عیدین کا کوئی تذکرہ قرآن میں ہے؟ کیا مشرکین مکہ بیت اللہ میں یا عیسائی ایلیاء میں اس کو قائم کرتے تھے؟ کیا یہود مدینے میں عیدین کی نماز پڑھتے تھے؟

غامدی حلقے کو نماز جنازہ کا بھی قائل نہیں ہونا چاہیے۔

اس لیے کہ انہوں نے اپنے نزدیک دین کے جو دو اور صرف دو مآخذ قرار دیے ہیں یعنی قرآن اور ''ملت ابراہیمی کی وہ روایت جس کو آپ ﷺ نے باقی رکھا اور جاری فرمایا'' اس روایت میں ہم کو نماز جنازہ نہیں ملتی ہے۔ مگر غامدی صاحب اس کو دین کا حصہ مان رہے ہیں۔ یہ کسی طرح خدا کی عبادت والی وہ نماز نہیں ہے، جس کا حکم ''اقیمو الصلوٰۃ'' کہہ کر دیا گیا ہے۔ یہ اصل میں میت کے لیے دعا کی ایک واجب رسم ہے اور کوئی شک نہیں کہ خدا کی عبادت والی نماز سے بالکل الگ ایک مستقل حکم اور دین کا مستقل حصہ ہے۔ یہ تمام وہ احکام ہیں جن کو اللہ کی وحی غیر متلو کے زیر حکم منصب رسالت سے دین قرار دیا گیا۔ قرآن میں اس کی طرف اشارہ ہے لیکن امت کو یہ حکم ملا رسول اللہ ﷺ کے ارشاد و عمل سے ہی ہے۔

بوالعجبی کی انتہا:

جناب غامدی صاحب کے لیے ایک مسئلہ یہ پیش آیا کہ، ان کے بقول، قرآن نے جانوروں میں سے صرف چار چیزوں یعنی مردار جانور، خون (دم مسفوح) غیر اللہ کے نام پر ذبح کیے گئے جانور اور سؤر کے گوشت کی حرمت بتائی ہے۔ باقی بہت سی اشیاء کے اللہ کی طرف سے حرام ہونے کی خبر ہمیں صرف رسول اللہ ﷺ سے ملی ہے۔ مثلاً تمام درندے جیسے شیر، چیتا، کتا، بھیڑیا، جانوروں میں ہاتھی گدھا، نیز پرندوں میں چیل، عقاب، گدھ، وغیرہ، تمام امت ان کو صرف ارشاد رسول ہی کی وجہ سے حرام مانتی آئی ہے۔

تو غامدی صاحب کیا کریں؟؟

اگر یہ کہیں کہ یہ سب چیزیں حرام نہیں ہیں اس لیے کہ ان کے نزدیک حدیث سے تو شریعت ثابت ہی نہیں ہوتی، تو بڑی گھناونی بات ہوگی۔

اور اگر ان چیزوں کو حرام کہیں تو اپنی فکر کی ساری عمارت زمیں بوس ہوئی جاتی ہے۔

اس مخمصے کا انہوں نے ایک حل نکالا۔ اور کیا ''خوب'' حل نکالا!!

انہوں نے ارشاد فرمایا کہ یہ دراصل انسان اپنی فطرت سے ہی جانتا ہے کہ یہ چیزیں گندی ہیں، اور کھانے پینے کے لیے نہیں بنی ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے ان چیزوں کو جو حرام قرار دیا ہے وہ کوئی شریعت کا بیان اور حکم نہیں ہے۔ محض فطرت انسانی کا بیان ہے۔ ان کا شریعت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ لوگوں (یعنی پوری امت کے تمام علماء) سے غلطی یہ ہوئی کہ انہوں نے ان باتوں کو شریعت کا بیان سمجھ لیا حالاں کہ وہ صرف فطرت کا بیان ہیں۔ حال آں کہ شریعت کی ان حرمتوں سے جو قرآن نے بیان کی ہیں ان کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

غامدی صاحب کہتے ہیں کہ:

> ''جانوروں کی حلّت وحرمت میں شریعت کا موضوع اصلاً یہ چار ہی چیزیں ہیں''۔ یعنی مردار جانور، خون (دم مسفوح) غیر اللہ کے نام پر ذبح کیا جانور اور سؤر کا گوشت۔ ''چنانچہ قرآن نے بعض جگہ ''قل لا أجد فی ما اوحی الیّ'' اور بعض جگہ ''اِنما'' کے الفاظ میں پورے حصر کے ساتھ فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جانوروں کی حلت وحرمت کے باب میں صرف یہی چار چیزیں حرام قرار دی ہیں۔.......(میزان صفحہ:۳۶)

باقی وہ چیزیں جن کو رسول اللہ ﷺ نے حرام قرار دیا جیسے تمام درندے جیسے شیر، چیتا، کتا، بھیڑیا، جانوروں میں ہاتھی، گدھا، نیز پرندوں میں چیل، عقاب، گدھ، وغیرہ۔ ان کے بارے میں جنابِ موصوف فرماتے ہیں ہم حضور ﷺ کی ان باتوں کو شریعت کا بیان نہیں سمجھتے، محض فطرت انسانی کا

بیان سمجھتے ہیں۔فرماتے ہیں کہ:

انسان کی فطرت بالعموم اس کی صحیح رہنمائی کرتی ہے اور وہ بغیر کسی تردد کے فیصلہ کر لیتا ہے کہ اسے کیا کھانا چاہیے اور کیا نہیں کھانا چاہیے۔ اسے معلوم ہے کہ شیر، چیتے، ہاتھی، چیل، کوے، گدھ، عقاب، سانپ، بچھو اور خود انسان کوئی کھانے کی چیز نہیں ہے۔ وہ جانتا ہے کہ گھوڑے، گدھے، دسترخوان کی لذت کے لیے نہیں، سواری کے لیے پیدا کیے گئے ہیں۔ ان جانوروں کے بول و براز کی نجاست سے بھی وہ پوری طرح واقف ہے۔

آگے فرماتے ہیں کہ:

بعض روایتوں میں (یہ جو) نبی ﷺ نے کچلی والے درندوں، چنگال والے پرندوں اور پالتو گدھے کا گوشت کھانے سے منع فرمایا ہے، اوپر کی بحث سے واضح ہے کہ یہ اُسی فطرت کا بیان ہے، جس کا علم انسان کے اندر ودیعت کیا گیا ہے۔ لوگوں کی غلطی یہ ہے کہ انہوں نے اِسے بیان فطرت کے بجائے بیان شریعت سمجھا، درآں حالیکہ شریعت کی اُن حرمتوں سے جو قرآن میں بیان ہوئی ہیں اس کا سرے سے کوئی تعلق ہی نہیں ہے۔

یعنی کتا، بلی، گدھا، سانپ، بچھو، چیل اور گدھ کھانا محض فطرت انسانی کے خلاف ہے، کوئی کھائے تو یہ دینی طور پر حرام نہیں ہے۔

غرض بوالعجبیوں اور تضادات کی ایک دنیا ہے۔ جہاں ہر لمحہ ناطقہ سر بگریباں ہے۔ غامدی صاحب نے ایک غلط تصور دین قائم کر لیا، پھر خود ان کو اس کے نتائج کا یارا نہ رہا۔ یہاں غامدی صاحب کا اصول ان سے تقاضہ کرتا تھا کہ وہ کہیں کہ حدیث سے دین میں چوں کہ کوئی نیا حکم ثابت ہی نہیں ہوسکتا اور ''یہ چیز حدیث کے دائرے ہی میں نہیں آتی کہ وہ دین میں کسی نئے حکم کا ماخذ بن سکے'' (میزان، صفحہ: ۶۱ ایڈیشن ۲۰۱۴ء)۔ اس لیے ان کی حرمت کا خیال شریعت سے ثابت نہیں ہے۔ یہ لوگوں کی غلطی ہے کہ انہوں نے کتے، بلی، گدھے، شیر چیتے، چیل، باز اور سانپ بچھو کو حرام سمجھ رکھا ہے۔

جب جناب غامدی صاحب کا اصول یہ ہے کہ ''یہ چیز حدیث کے دائرے ہی میں نہیں آتی کہ وہ دین میں کسی نئے حکم کا ماخذ بن سکے''، اور اس سے ''دین میں کسی عقیدہ و عمل کا اضافہ بھی نہیں ہوتا''۔ (میزان: صفحہ: ۱۵) تو پھر یقیناً وہ کتے، بلی، چیتے، شیر، گدھے اور سانپ بچھو کو دین میں حرام نہیں کہہ سکتے۔

جناب غامدی صاحب کے انکار حدیث کا یہی منطقی تقاضہ اور لازمی نتیجہ ہے۔ مگر وہ بہت ذہین آدمی ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ یہ تو ان کے عقیدے و مسلک سے لوگوں کو متنفر کر دے گا۔ اور پھر کون مسلمان ان کے لیکچرز سنے گا اور ان کو ''اسلامی اسکالر'' مانے گا؟ اور کون ان کے حقیقی فکر کے نتائج کو سن کر کان نہ پکڑے گا کہ ایسی گمراہی سے خدا کی پناہ!!

اس لیے انہوں نے ایک مضحکہ خیز تاویل اختیار فرمائی۔ اور ایسا عجیب و غریب جوڑ بٹھایا کہ یہ کسی طرح ذہن قبول نہیں کرتا کہ غامدی صاحب جیسا ذہین وزیرک انسان ایسی لچر باتوں پر کبھی اپنے دل کو مطمئن کر سکا ہوگا۔

کل کو غامدی صاحب کا کوئی خوشہ چیں ان کے اسی اصول کو لے کر یہ کہہ سکتا ہے کہ:

''استاذ امام'' کا یہ دعویٰ غلط ہے کہ کتا، بلی، لکڑ بگھا، چیتا، ہاتھی، گدھا اور گدھ، چیل وغیرہ

انسانی فطرت کی رو سے کھانے پینے کی چیز نہیں۔ نہ جانے کتنی اقوام کی مرغوب غذا میں کتا اور بندر شامل ہے۔ چینیوں کے یہاں سانپ نہایت لذیذ و پسندیدہ کھانا ہے۔ جن اقوام نے یہ چیزیں نہیں کھائیں یہ ان کے ''کلچر'' کی روایت ہے۔ یہ مزعومہ کہ ان چیزوں سے ابا فطرت انسانی میں ودیعت ہے اس کی کوئی دلیل سوائے ''استاذ امام'' کے ذوق کے نہیں۔

رہی یہ بات کہ نبی ﷺ نے ان چیزوں کو حرام قرار دیا ہے؟ تو وہ کوئی مسئلہ نہیں۔ اس لیے کہ ہمارے موقف میں جس کو ہم نے ''پوری قطعیت کے ساتھ واضح'' کر دیا ہے، ''یہ چیز حدیث کے دائرے ہی میں نہیں آتی کہ وہ دین میں کسی نئے حکم کا ماخذ بن سکے''۔ لہٰذا کتے، چیتے، بلی، ہاتھی، بندر، سانپ، بچھو کو لوگوں نے غلط حرام قرار دے دیا ہے۔ نہ فطرت انسانی کی رو سے یہ چیزیں کھانے کے نا قابل ہیں اور نہ خدا کی شریعت کے محرّ مات میں سے ہیں۔

ظاہر ہے کہ اس شاگرد رشید کا موقف بڑا کریہہ اور وحشت انگیز ہے، لیکن ہے سو فیصد غامدی صاحب کے اصول ومنطق اور ان کے دینی عقیدہ پر قائم۔ دین کے اگر غامدی اصول قبول کر لیے جائیں تو شریعت کے بڑے حصے کو دریا برد کرنا بس اسی جیسی چند تقریر ہائے دل پذیر کا محتاج رہ جائے گا۔

سارے انحراف کی بنیاد:

یہ تو یقینی اور بدیہی ہے کہ غامدی صاحب نے دین کے ماخذ کے متعین کرنے میں جو جدت کی ہے وہ امت کی تاریخ میں کسی نے نہیں کی۔ سب سے بڑی حیرت کی یہ بات ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی بعثت و رسالت کے ۱۴ صدیوں بعد ایک شخص کھڑا ہوتا ہے اور کہتا ہے کہ، دین کا ماخذ کیا ہے، یہ مسلمانوں کے اگلوں نے سمجھا نہ پچھلوں نے۔ میں وہ فرد فرید ہوں جو یہ پتہ لگانے میں کامیاب ہوا ہے کہ دین کا ماخذ کیا ہے۔

حیرت سے دماغ ششدر کہ جناب غامدی صاحب جیسا ایک اچھا خاصا سمجھ دار آدمی کیسی باتیں کر رہا ہے! وہ کہتا ہے کہ اگر چہ رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانے والے صحابہ ہزار ہا ہزار کی تعداد میں ہوئے، یہ بھی مانتا ہے کہ وہ چمن انسانیت کے گل سرسبد اور شجر اسلام کے بہترین ثمر تھے، اور یہ بھی کہتا ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ نے دین کی تبلیغ و تفہیم میں کوئی کسر نہ چھوڑی، مگر ساتھ ہی کہتا ہے کہ رسول، اپنے ان صحابہ کے لیے جو خلاصۂ انسانیت تھے، یہ تک واضح نہ کر سکا کہ اسلام کے ماخذ کیا ہیں؟ صحابہ کے بعد امت کی جو ساری علمی تاریخ ہے جس کے تسلسل میں تابعین عظام، ائمۂ اسلام، اور بے شمار علماء کی قطاریں کھڑی ہیں وہ سب دین کے معاملے میں (معاذ اللہ) ایسے جاہل و کم مایہ ہوئے کہ ان کو یہ تک پتہ نہیں چل سکا کہ دین ان کو کہاں سے لینا ہے!!

آج جناب غامدی صاحب نے دنیا کے سامنے یہ حقیقت واضح فرمائی کہ ''دین لاریب صرف دو صورتوں میں ہے: ایک قرآن اور دوسرے ملت ابراہیمی کی وہ روایت جو یہود و نصاریٰ میں اور عرب کے مشرکین میں چلی آ رہی تھی، جسے رسول اللہ ﷺ نے اپنی تائید و تصویب کے ساتھ امت میں دین کی حیثیت سے جاری کیا۔ ان دونوں کے علاوہ کوئی چیز نہ دین ہو سکتی ہے اور نہ اسے دین قرار دیا جا سکتا ہے''۔

پھر طرفہ دیکھیے! جناب غامدی صاحب اس قدر بڑا دعویٰ فرماتے ہیں اور دین کا ماخذ و اصل (Source) ایسا نیا بیان کرتے ہیں جو آج تک کسی نے نہیں بتایا، اور ماشاء اللہ پوری کتاب 'میزان' اپنے اس دعوے کی دلیل سے خالی !! یعنی

دلیل کے نام پر کوئی معمولی سی چیز بھی اس کی جناب پیش نہیں فرماتے کہ محمد رسول اللہ کا کوئی حکم یا تحلیل وتحریم کا کوئی ارشاد صرف اسی وقت دین اور شریعت قرار پائے گا جب وہ ملت ابراہیمی کی روایت کا حصہ ہو۔ اتنا بڑا دعویٰ، اور حجت بس یہ کہ میں یہ سمجھتا ہوں!!

سبحان مُظہرِ العجائب! خدایا! رحم فرما۔

اس تحریر کا مقصد جناب غامدی صاحب کی تردید اور ان کے افکار کا علمی جائزہ لینا نہیں ہے۔ بس مطمح نظر یہ ہے کہ یہ واضح کر دیا جائے کہ وہ بنیادی طور پر ایک خاص طرح کے منکر حدیث ہیں۔ اور یہ کھول کر سامنے رکھ دیا جائے کہ ان کے فکر ومسلک کے کیا لازمی نتائج ہیں۔

انہوں نے اپنے نزدیک جو دین طے کیا اور اپنی کتاب میزان کے دیباچہ میں اس اظہار واعلان کے ساتھ پیش کیا ہے کہ:

> اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے۔ کم وبیش ربع صدی کے مطالعہ وتحقیق سے میں نے اس دین کو جو کچھ سمجھا ہے، وہ اپنی اس کتاب میں پیش کر دیا ہے۔

اس میں رسول اللہ ﷺ کی حدیث کا یہ مقام نہیں ہے کہ وہ دین میں کسی نئے حکم کا ماخذ قرار پا سکے۔ ہاں اگر رسول اللہ ﷺ کے حکم وارشاد کی تائید ''ملت ابراہیمی کی روایت'' سے ہو جائے تو آپ ﷺ کا حکم دین میں جگہ پا جائے گا۔ ورنہ چاہے آپ ﷺ کسی چیز کو حرام کہیں، یا اس کے مرتکب پر لعنت بھیجیں، یا اس پر اللہ کے عذاب کی وعید سنائیں، یا کسی چیز کو من جملۂ واجبات فرمائیں اور حکم دیں، وہ چیزیں ضروری یا دینی حکم کا درجہ نہیں پا سکیں گی۔ ایسے موقعے پر کسی خوبصورت سی عبارت کے ذریعے ان احکامِ رسول کو غامدی دین ومسلک میں ''لغو'' قرار دے دیا جائے گا۔ اس لیے کہ ان کے یہاں تو ''یہ چیز حدیث کے دائرے ہی میں نہیں آتی کہ وہ دین میں کسی نئے حکم کا ماخذ بن سکے''۔

جناب غامدی صاحب اپنی ان واضح عبارتوں کے باوجود اگر یہ اصرار فرماتے ہیں کہ حدیث وسنت کے بارے میں ان کا اور عام علماء سلف کا موقف حقیقت میں ایک ہی ہے، اختلاف صرف اصطلاح کا یا علمی ترتیب کا ہے، جیسا کہ انہوں نے بھی کہا ہے اور ان کے کارپردازان وکلاء صفائی گھما پھرا کر کہتے رہتے ہیں، (اور ہماری بھی دلی دعا ہے کہ ایسا ہو جائے) تو ان کو واضح طور پر اپنی اِن مذکورہ عبارتوں سے رجوع کرنا چاہیے۔ یہ عبارتیں انہوں نے اپنی سب سے مرکزی کتاب میں لکھی ہیں۔ ان کا مطلب بالکل واضح ہے۔ اور خود ان کے رسالے نے اسی مفہوم کے مطابق ان کی آراء کی توجیہ کی ہے، اور یہ دکھایا ہے کہ ان کی رائے کے مطابق رسول اللہ ﷺ کا کوئی حکم یا عمل اسی وقت دین قرار پاتا ہے جب اس کی اصل ملت ابراہیمی کی قدیم روایت میں پائی جاتی ہو۔

اس بنیادی مسئلے کی وضاحت کے بعد ان کی تاویلات وتوجیہات اور اختراعات کے تفصیلی جائزے کی ضرورت شاید نہیں رہتی۔ ان کی بعض آراء صحیح ہو سکتی ہیں۔ لیکن ایسی بنیادی گمراہی کا حامل شخص دین کے سلسلے میں لائق توجہ قطعاً نہیں رہتا۔ ایسے حضرات سے دین سیکھنا بڑی غلطی کی بات ہے۔

جس کو ہو دین ودل عزیز اس کی گلی میں جائے کیوں؟

ہم اللہ سے جہاں اپنے لیے بھی ہدایت واستقامت اور توفیق ارزانی کی دعا کرتے ہیں، اُن کے لیے بھی کرتے ہیں کہ اللہ ان کو محمد رسول اللہ ﷺ کے دین حق کی سمجھ اور امت کی بہترین نسل صحابۂ کرام کے طرز پر دین کے فہم کی توفیق عطا فرمائے۔

☆☆☆

❑ تعلیم و تربیت

تربیت اولاد- چند اہم گوشے

تلخیص وترجمانی
ڈاکٹر محمد طارق ایوبی

نتائج کے بارے میں غور و فکر:

بہت سے والدین یہ کہتے ہیں کہ مذکورہ بالا گفتگو میں کوئی حرج نہیں، مگر اصل بات یہ ہے کہ ہم اس وقت جس مشکل سے دوچار ہیں اس میں صرف نتائج پر ہی توجہ مرکوز نہیں رکھ سکتے، یہی وجہ ہوتی ہے کہ پھر وہ اپنے بچوں کے ساتھ اسی طریقہ سے برتاؤ کرنے لگتے ہیں جس کے وہ عادی ہوتے ہیں، یعنی بار بار حکم دینا، بحث وتکرار اور تنازعہ کی صورتِ حال پیدا ہونا وغیرہ، ظاہر سی بات ہے کہ اگر ہم نتائج کے بارے میں نہیں سوچیں گے تو بسا اوقات ہم کو اچانک غیر اصولی فیصلے لینے پڑیں گے، ایسی صورت حال سے متعلق عام طور پر یہ نصیحت کی جاتی ہے کہ ایسے مواقع پر جبکہ گھر میں جذباتی ماحول ہو، بچے اور والدین دونوں ہی تناؤ محسوس کر رہے ہوں، تو والدین کو چاہیے کہ فیصلہ لینے میں تاخیر کریں، اس کو کسی اور وقت کے لیے اٹھا رکھیں، اس سے یہ فائدہ ہوگا کہ سب کو سوچنے کا ایک موقع مل جائے گا اور پھر بآسانی کسی نتیجہ پر پہنچنا ممکن ہوگا۔

والدین کو کبھی کبھی یہ بھی کرنا چاہیے کہ بچوں نے جو کام کیا، اس کے نتائج کے متعلق ان سے سوال کریں، مثلاً بچے نے والد کا قلم توڑ دیا یا کھو دیا تو والد اس سے یوں پوچھیں ''اب تم مجھے کہاں سے نیا قلم لا کر دو گے''۔

اسی طرح جب کبھی بچے آپس میں جھگڑنے لگیں تو ماں ان سے اس طرح سوال کر سکتی ہے، (''ارے آج شام سے ہی تم لوگ ایک دوسرے سے غصہ ہو، یہ بتاؤ مار پیٹ اور جھگڑے کے علاوہ آج تم لوگ اور کیا کر سکتے ہو''؟) ظاہر ہے کہ اس سوال کے ضمن میں بچوں کے سامنے متعدد اختیارات و آپشن ہوں گے جو اصل مقصود بھی ہیں۔

بعض صورتیں ایسی بھی ہوتی ہیں جن میں اختیارات واضح نہیں ہوتے، خاص طور پر تب جبکہ ہم یہ طریقہ استعمال کرتے ہیں ''ہاں تمہارے لیے یہ کرنے کے بعد ایسا کرنا ممکن ہوگا'' یعنی ''تم ہوم ورک مکمل کرنے کے بعد پارک میں کھیل سکتے ہو''، ''تم کمرے کی ترتیب و تنظیم کے بعد ٹی وی پر سیریل دیکھ سکتے ہو''، ''تم کھانے کے بعد چاکلیٹ کھا سکتے ہو''۔

ان مثالوں میں دیکھا جا سکتا ہے کہ بچے کے سامنے حقیقی طور پر اختیارات ہیں، ظاہر ہے کہ یہاں اس سے ہوم ورک مکمل کرنے، کمرہ مرتب کرنے اور کھانا کھانے پر اصرار نہیں کیا جا رہا ہے، بلکہ اس کی چاہت کے مطابق اس کو اختیار دیا جا رہا ہے، وہی اپنے اختیار کے نتائج کو برداشت کرے گا،

گویا اس طرح اس کو اس باہمی اتفاق کی یاد دہانی کرائی جارہی ہے کہ جب وہ اپنی ذمہ داری پوری کرلے گا تو پھر اپنی خواہش پر عمل کرسکے گا، اس میں کوئی شک نہیں کہ اس انداز گفتگو میں مثبت روح شامل ہے، یہ کہنا بہتر ہے کہ ''تم اپنا ہوم ورک مکمل کرنے کے بعد میگزین خرید سکتے ہو'' بجائے اس کے کہ اس سے کہا جائے: ''ہرگز نہیں! تم میگزین نہیں خرید سکتے کیونکہ تم نے ہوم ورک نہیں مکمل کیا''، یاد رکھنا چاہیے کہ لوگوں کے ساتھ برتاؤ اور بالخصوص بچوں کی تربیت میں اس مثبت اندازِ گفتگو کا بڑا مفید اور تعمیری کردار ہوتا ہے۔

تربیت میں دور اندیشی سے کام لینا:

بچے کو اپنے اختیار و افعال اور برتاؤ کے نتائج کا مقابلہ کرنے اور برداشت کرنے کی تعلیم دینے والے طریقہ کے لیے بڑے عزم و حوصلہ اور دور اندیشی کی ضرورت ہے، اس میں سختی اور تُرش روئی وغیرہ کی گنجائش نہیں ہوتی، کبھی کبھی پڑوسی اور دوست و احباب کی گفتگو سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ محض یہ توقع کرتے ہیں کہ ایک والد کو صرف ''اچھا باپ'' ہونا چاہیے نہ کہ ''ذمہ دار باپ''، چنانچہ اب اگر آپ اپنے بچے کو تاخیر سے مدرسہ جانے کی اجازت دے دیں، (اوپر گفتگو ہوچکی ہے) تو آپ پر تنقید کریں گے اور اس طرح کریں گے کہ گویا آپ کو اس کی فکر ہی نہیں ہے کہ آپ کا بچہ وقت پر مدرسہ پہنچے، کبھی تنقید سے آگے بڑھ کر جرم کا احساس دلائیں گے کیونکہ بچہ جب صبح جلدی جلدی اسکول کے لیے نکلا تھا تو ٹفن لے جانا بھول گیا تھا، ان حالات میں آپ کو اپنے آپ پر قابو رکھنا ہوگا اور پورے اطمینان کے ساتھ اپنے اصول پر عمل پیرا رہنا ہوگا، اس لیے کہ آپ کا بچہ جن تجربات سے گذر رہا ہے، خواہ اسکول دیر سے پہنچ رہا ہے یا ٹفن بھول کر جارہا ہے، یہ تجربات زندگی کے لیے بے حد مفید ثابت ہوں گے، کیونکہ ان ہی تجربات سے وہ اپنے افعال کے نتائج کو برداشت کرنا سیکھے گا، اسے اپنی کمی اور کوتاہی کا احساس ہوگا، آئندہ وہ اپنی زندگی میں مزید ذمہ داریاں ٹھانے کا اہل بنے گا، خود اگر اپنے آپ نظر ڈالیے تو ہم سب بڑے اپنے اعمال و اقدامات کے نتائج سے روزمرہ نت نئے تجربات حاصل کرتے ہیں۔

یہ بات واضح ہے کہ نتائج میں غور و فکر کا طریقہ اختیار کرنے کے لیے ضروری ہے کہ بچے کے لیے حدود و ضوابط متعین کیے جائیں، ایسے بچے جو ضدی ہوتے ہیں اور ہمیشہ اپنا مطالبہ پورا کرا لیتے ہیں، اپنی خواہشات زبردستی دوسروں پر تھوپنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں، وہ وقت کے ساتھ ساتھ خود اپنے ہی دشمن بن جاتے ہیں، بچوں کے لیے اگر حدود و ضوابط نہ مقرر کیے جائیں تو ان کی زندگی پریشان کن بن جاتی ہے، سکون و اطمینان ان کی زندگی میں مفقود ہوتا ہے، اور پھر حدود و ضوابط متعین نہ ہونے کا سب سے بڑا اور بدترین نقصان یہ ہوتا ہے کہ بچے پر خود اس کی ذات یا اس کی صلاحیت اور اس کے اوصاف کھلنے کا اسے موقع نہیں ملتا، وہ اپنی ذاتی خصوصیات سے واقف نہیں ہو پاتا جس کی انسانی زندگی میں بنیادی اہمیت ہے، یہاں آپ برتاؤ کے نتائج سے متعلق کچھ اور مثالیں ملاحظہ کیجئے:

ماں دو سالہ سعید کے لیے جاڑے کی آمد کے پیش نظر جوتے خریدنے کی کوشش کرتی ہے، مگر بازار میں ہی وہ ماں سے گرمی کے موافق چپلیں خریدنے پر اصرار کرتا ہے، ماں اس کی خواہش کو ٹالنے کی کوشش کرتی ہے تو وہ بھرے بازار میں لوگوں کے سامنے چیخنا چلانا اور رونا شروع کردیتا ہے، یہاں کشمکش کا تعلق محض تسلط و اختیار سے ہے، بچہ غیر شعوری طور پر یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ لوگوں کے بیچ ایسا کرنے سے ماں کس حد تک یہ برتاؤ برداشت کرسکتی ہے؟ اس کے بالمقابل اگر ماں بچے کی خواہش کو تسلیم کرلے اور اس سے کہے کہ وہی خریدنے کو تیار ہے جو وہ چاہتا ہے، پھر وہ بغیر نئے جوتے خریدے

ہوئے دکان سے نکل آئے، ظاہر ہے کہ نئے جوتے خریدنے میں اگر کچھ دن کی تاخیر ہوجائے گی تو کوئی مسئلہ نہیں، بعد میں ماں کو چاہیے کہ وہ بچے کو سمجھائے کہ جب تم اچھی طرح برتاؤ کے لیے تیار ہوگے تو پھر ہم دونوں دوبارہ جوتے خریدنے چلیں گے، اس سے آپ دیکھیں گے کہ صرف دوسالہ بچہ میں بھی عمل و برتاؤ کے نتائج کو سمجھنے کی صلاحیت پیدا ہوگی۔

پانچ سالہ سعدیہ ہر رات کو جب سونے کے لیے لیٹتی ہے تو بار بار بستر سے اتر کر بھاگتی ہے، ماں اس مسئلہ کو حل کرنے کی کوشش کرتی ہے، چنانچہ جب بچی شام کو سونے کے لیے بیت الخلا وغیرہ سے فارغ ہوکر بالکل تیار ہوجاتی ہے تو ماں اس سے کہتی ہے: ''اگر تم بار بار بستر سے اٹھیں تو میں کمرے سے باہر گیلری کی لائٹ بجھا دوں گی تا کہ تم آسانی سے سوسکو، اب تم جو چاہو اختیار کرو تمہارے سامنے دونوں آپشن ہیں''، پھر جب سعدیہ بستر سے اتری تو ماں نے یہ کہتے ہوئے لائٹ بجھانا چاہا: ''اب میں لائٹ بند کر رہی ہوں جیسا کہ میں نے پہلے کہہ دیا ہے، کل پھر میں اس کی کوشش کروں گی کہ تم بغیر لائٹ بند کیے سو جاؤ''، ظاہر ہے کہ یہ سنتے ہی سعدیہ رونا شروع کر دے گی، اس کی کوشش ہوگی کہ اس کے رونے سے ماں اپنا ارادہ ترک کر دے، ماں اپنی بات پر عمل کرنا چاہے گی، وہ قطعی اس کی اجازت نہیں دے گی کہ آنسوؤں کے ذریعہ موقف سے کھلواڑ کیا جائے، اس تعامل کے ذریعہ ماں بچی کے سامنے اختیار و برتاؤ کے نتائج کو برداشت کرنے کا دروازہ کھولے گی، یہ الگ بات ہے کہ اس کے آنسوؤں کے سبب وہ اس کی بات کو سنے گی اور اس سے اس کو کچھ وقتی طور پر تکلیف بھی ہوگی۔

۸/سال کے عادل کو اس کے دوست نے اپنا نیا کھلونا دیکھنے کے لیے اپنے گھر بلایا، تو اس سے اس کے والد نے کہا ''اسکول کا کام پہلے مکمل کر کے ہی تمہارے لیے دوست سے ملنے جانا ممکن ہوگا'' اس کے باوجود عادل بیٹھ کر اپنا وقت برباد کرتا رہا، اس نے کام بھی نہیں پورا کیا اور دوست کے یہاں جانے کا وقت بھی آ گیا، اب اس نے اس طرح فریاد شروع کی والد اس کو جانے کی اجازت دے دیں، لیکن والد کی دوراندیشی یہ ہوگی کہ بڑی خوبصورتی اور نرمی سے اس کو ٹال دیں اور جانے کی اجازت نہ دیں، اگر وہ رٹ لگالے اور بار بار اجازت مانگے تو پھر والد کو چاہیے کہ کسی کام کے بہانے کمرے سے نکل جائیں اور اپنے کام میں لگ جائیں۔

دس سالہ سمیر اور ۱۳ سالہ زید دونوں اپنے والد کی گاڑی میں ہیں اور دونوں کا آپس میں جھگڑا شروع ہوگیا، والد نے گاڑی روکی اور کہا: ''میں تم لوگوں کے جھگڑے کے دوران گاڑی نہیں چلاسکتا، اب یا تو تم لوگ جھگڑا بند کرو یا پھر گاڑی سے اترو اور پیدل گھر جاؤ، دو میں سے کوئی ایک کام کرو''، اب اس طریقہ کار میں کسی قسم کی دھمکی اور ڈانٹ وغیرہ کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ والد نے ان کو اختیار دے دیا کہ یا تو دونوں سنجیدگی سے بیٹھیں یا اتر جائیں، ظاہر ہے کہ اس میں سے کوئی ایک آپشن بچوں کو اختیار کرنا پڑے گا اور والد کو بھی ان کے انتخاب کو تسلیم کرنا پڑے گا۔

فیضان نے اپنی ماں سے شام کو جس وقت گھر لوٹنے کا معاہدہ کیا تھا اس سے بہت زیادہ تاخیر سے آیا، ماں نے اس سے کہا: ''فیضان تم سے یہ طے ہوا تھا کہ تم سات بجے گھر آ جاؤ گے چونکہ تم نے معاہدہ کی پابندی نہیں کی اس لیے اب کل تم کو ۶/بجے واپس آنا پڑے گا، ایک ہفتہ بعد پھر ہم از سر نو ۷/بجے والے معاہدہ کا تجربہ کریں گے''، اب اگر فیضان پھر تاخیر سے آئے اور وقت مقرر پر نہ لوٹے، تو بار بار وقت تبدیل کر دیا جائے مثلاً ۶/بجے کیا تھا تو پھر دوبارہ لیٹ ہونے پر ساڑھے پانچ کر دیں تا آنکہ وہ باہمی طور پر واپسی کے لیے طے کیے گئے وقت کی پابندی شروع کر دے۔

یہ ساری مثالیں اس طریقۂ کار کی ہیں جس کا تعلق نتائج پر توجہ مرکوز کرنے سے ہے، ساری مثالوں میں جو بات مشترک ہے وہ کہ ان سب میں عمل کا دخل زیادہ ہے گفتگو اور تکرار بہت کم، بچوں کی تربیت، تادیب اور مشکلات کو حل کرنے میں نتائج کے اعتبار سے برتاؤ کرنے کو بڑا مفید و مؤثر وسیلہ تربیت سمجھا جاتا ہے، یہ بات ملحوظ رہے کہ اس طریقہ تربیت کی تطبیق اور اس کا نفاذ تب ہی ممکن ہوتا ہے جب والدین کے دل میں بچوں کا بہت زیادہ احترام جاگزیں ہو۔

سوالات:

سوالات یہ ہیں کہ جب بچہ یا بچی ایسا کرے جیسا کہ سوالات میں مذکور ہے تو عام طور پر والدین کا کیا رد عمل ہوتا:

- بچی شدید غصہ کا اظہار کرتی ہے اور گھر میں چیختی ہے؟
- بچی بازار میں لوگوں کے سامنے بڑے غصہ کا اظہار کرتی ہے؟
- بچی صبح بستر سے اٹھنے سے انکار کر دیتی ہے؟
- بچہ اسکول کا ہوم ورک ختم کرنے کے بجائے ٹی وی دیکھنا چاہتا ہے؟
- گھر واپس آنے کا جو وقت طے ہے بچہ اس وقت پر آنے میں تاخیر کرتا ہے؟
- بچہ اہل خانہ کی معاونت کرنے اور گھریلو کام کرنے سے منع کر دیتا ہے؟
- بچی کپڑے پہننے میں سستی کرتی ہے اور صحیح ڈھنگ سے نہیں پہنتی؟
- بچہ اپنی چھوٹی بہن کو پریشان کرتا ہے اور اسے ڈراتا ہے؟
- بچہ دوسرے بچوں کے ساتھ جھگڑا لڑائی کرتا ہے؟
- بچی اپنے کمرے کو گندا اور غیر مرتب چھوڑ دیتی ہے؟

اپنے کسی بچے کی تربیتی یا اخلاقی کسی ایک مشکل کے بارے میں تصور کیجئے اور پھر سوچیے کہ آپ اس مشکل سے نجات پانے کے لیے نتائج عمل کے طریقہ سے استفادہ کرتے ہوئے کیا طریقہ استعمال کریں گے؟

اور پھر اس معالجہ کی ابتدا کے لیے مناسب وقت کیا ہوگا؟

آپ کے لیے کس طرح یہ ممکن ہوگا کہ آپ علاج کو دھمکی و سزا سے بچتے ہوئے بشکل اختیار (Option) پیش کریں؟

عملی موقف اور مثال:

ان حالات میں عام طور پر والدین کس طرح سلوک کرتے ہیں؟

ان جیسے حالات میں آپ نتائج عمل کے طریقہ کو کیسے منطبق کریں گے؟

حسین کی عادت ہے کہ وہ اسکول جاتے ہوئے اپنی ضرورت کی بعض چیزیں بھول جاتا ہے، کبھی اسکول بیگ، کبھی ٹفن، کبھی کوٹ وغیرہ، ماں کو یہ چیزیں اسکول پہنچانے میں بڑی مشکلات پیش آتی ہیں، وہ بار بار اس کو تاکید سے یاد دلاتی ہے کہ اپنی ضرورت کے چیزیں ساتھ لے لے، لیکن وہ بار بار بھول کر جاتا ہے اور بڑی آسانی سے بس یہ کہہ دیتا ہے کہ ''وہ بھول گیا تھا''۔

۸/ سالہ فاطمہ اور ۱۰/ سالہ زید میں بڑی کثرت سے جھگڑا ہوتا ہے، دونوں ایک دوسرے کے ساتھ مار پیٹ کرتے ہیں اور ایک دوسرے کو ڈراتے ہیں، پھر بسا اوقات ایک یا دونوں شکایت کے لیے ماں یا باپ کے پاس دوڑتے آتے ہیں۔

ام صلاح کے ۹/ سال سے ۱۴/ سال تک بچے ہمیشہ کپڑے اپنے کمرے کے فرش پر ڈال دیتے ہیں یا حمام

میں چھوڑ آتے ہیں، وہ ہمیشہ ان کے کپڑے اٹھاتی ہیں، وہ ہمیشہ اس سلسلہ میں ان کو سمجھاتی اور بتاتی ہیں لیکن بچوں پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔

۳؍سالہ فوزیہ کھانے کے اوقات کی کوئی پروانہیں کرتی، کھیل یا گپ شپ میں وقت گذار دیتی ہے، کیونکہ اس کو یہ سمجھ میں آ گیا کہ ماں اس سے بار بار کھانے کو کہے گی، تو اس طرح اس کو ماں کی توجہ زیادہ حاصل ہوگی، اس کو ایک لقمہ منہ میں رکھنے کے لیے اپنی خوب لمبی لمبی تعریفیں سننے کو ملیں گی، اس طرح فوزیہ کے کھانے کے سبب کھانے کا دسترخوان گفتگو کے ایک اسٹیج میں تبدیل ہوجائے گا۔

عرفان دھیرے ریڈیو سنتا ہی نہیں ہے، وہ اتنی بلند آواز میں سنتا ہے جس سے گھر کا ہر فرد پریشان ہوکر رہ جائے۔

اھل خانہ کے لیے ھدایات:

بچوں کو ادب وتہذیب سکھانے اور ان کی تربیت کرنے کے بہت سے طریقے ہیں، ہر طریقہ کی بنیاد بچے کی اپنی ذاتی صفات، والدین کے مزاج، مطلوبہ برتاؤ کی نوعیت اور گھر اور اس کے آس پاس کے ماحول پر ہے، چنانچہ کبھی کبھی بچے کو پریشانی سے نکالنے کے لیے اس کے ساتھ صرف گفتگو سے بات بن جاتی ہے، کبھی ذمہ داری اٹھانے کی تربیت کے لیے وقت متعین کرنا پڑتا ہے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ جتنے بھی طریقے تربیت کے لیے اختیار کیے جاتے ہیں ان سب میں سب سے مؤثر ومفید طریقۂ تربیت نتیجہ عمل کو ملحوظ رکھنے اور اس کو برداشت کرنے کا عادی بنانا ہے۔

اس طریقہ کو منطبق کرنے کے لیے ہمیں مندرجہ ذیل امور کی ضرورت پڑتی ہے:

۱- بچے کو اختیار وانتخاب کا موقع دیجئے، اس سے اس کے اندر اعتماد پیدا ہوگا اور اپنی قدر کا اس کو احساس ہوگا۔

۲- عملی اقدام کیجئے صرف بات چیت نہیں۔

۳- ہر حال میں نرمی اور محبت کو ملحوظ رکھیے، بچے سے اس طرح گفتگو کیجئے، ''آپ کے لیے ممکن ہے کہ کل آپ دوبارہ یہ کام کرنے کی کوشش کریں''۔

اگر آپ حکم دینے کے اسلوب کو اختیار دینے کے طریقۂ تربیت میں تبدیل کرنا چاہتے ہیں تو آپ کو اس طرح کی تعبیرات کا استعمال کرنا پڑے گا ''اگر آپ ایسا کرنا چاہیں.....'' بجائے اس کے کہ آپ کہیں ''ایسا نہ کرو.....'' مثلاً آپ بچے سے کہتے تھے ''لکڑی کی میز پر روٹی رکھ کر اس طرح چھری سے نہ کاٹو''، آپ اسی بات کو اب یوں کہیے ''اگر آپ کو روٹی کے ٹکڑے کرنا ہے، اس کو کاٹنا ہے، تو آپ اس کو اس لکڑی پر رکھ کر ہی کاٹیے جو اس کے لیے خاص ہے''۔

آپ کو نتائج پر توجہ دینے والے اسلوب کے استعمال میں بہت باریک بینی، دور اندیشی اور نرم رویّہ کی ضرورت ہوگی، اچانک پیش آنے والے امور سے قطعِ نظر خاص طور پر ان حالات میں آپ کو زیادہ ضرورت ہوگی جو بار بار پیش آئیں، یعنی جب بچہ ایک ہی برتاؤ کو بار بار دوہرائے۔

نتیجہ عمل پر توجہ مرکوز کرنے کا طریقہ کوئی سزا نہیں ہے، بلکہ بچے کو اختیار وانتخاب کا موقع فراہم کرنا محض اس کی تعلیم وتہذیب اور تادیب کی ایک کوشش ہے، اس کے ذریعہ اس کو ذمہ داری اٹھانے کی تعلیم دینا مقصود ہے، پھر بھی اگر بچے میں پختگی نہ آئے اور اس کے اندر ذمہ داری اٹھانے کی صلاحیت میں اضافہ نہ ہو تو پھر اپنے برتاؤ اور طریقۂ تربیت کا دوبارہ جائزہ لیجئے۔

بچے کے ساتھ تعامل میں جن چیزوں کو نافذ کرنا ہے اس میں بہت دور اندیش ہونا ضروری ہے، بہت سے والدین بچوں کو اکثر ان چیزوں سے ڈراتے ہیں جن کو وہ کبھی نافذ نہیں کرتے، مثلاً اگر بچے کے ساتھ یہ طے پا گیا کہ کھانا ۶؍بجے کھایا جائے گا اور بچہ ساڑھے ۶؍تک بھی نہیں پہنچا، تو

پھر افضل طریقہ یہی ہے کہ اس کو دیر سے آنے کے نتیجہ کا تجربہ کرنے کے لیے چھوڑ دیا جائے، بجائے اس کے کہ اس کے احترام ومحبت میں الگ سے کچھ اس کو پکا کر دیا جائے۔

اگر گھر میں کوئی نئی مشکل پیش آئے تو بہتر طریقہ یہ ہے کہ بیٹھ کر اس پہ غور وفکر کیا جائے تاکہ نتیجتاً کچھ نئے افکار سامنے آئیں، تمام اہل خانہ سے یوں کہا جائے ''کیا خیال ہے آپ کا اس سلسلہ میں ہم کو کیا کرنا چاہیے''، اس سے نقد فائدہ یہ ہوگا کہ بچوں کو اس مشکل کو حل کرنے میں اپنے کردار کا احساس ہوگا۔

والدین کو اس کی بھی کوشش کرنی چاہیے کہ وہ تربیت اولاد کے مختلف طریقوں اور تجربات کے درمیان موازنہ کریں، یہ بات بھی اچھی طرح ذہن نشین رہے کہ زیادہ بہتر نتیجہ بھی تب ہی نکلے گا جب تربیت کے دو اہم عنصر تشجیع (حوصلہ افزائی) واستماع (اچھی طرح توجہ سے سننا) کا استعمال کیا جائے گا۔ (ان پر گذشتہ صفحات میں گفتگو ہوچکی ہے)۔

یہ بھی بہت اہم اور قابل غور پہلو ہے کہ جب ہم اولاد کو مہذب بنانے کی کوشش کریں، ان کو نظام کی پابندی سکھائیں تو خود بھی تہذیب اور اصولوں کی پابندی سے غفلت کا نہ برتیں، اگر خود چیخنے کے عادی ہیں، دوسروں کی بات کاٹتے ہیں، دوسروں کو لعن طعن کرتے ہیں، مار پیٹ کرتے ہیں، تو بچے بھی پھر یہی سب کچھ سیکھیں گے، اسی طرح اگر ہم خود دور اندیش ہیں، نرمی برتنے کے عادی ہیں، امانت دار ہیں، دوسروں کی بات اچھی طرح سنتے ہیں، معذرت خواہانہ رویّہ اختیار کرتے ہیں، معافی طلب کرنے کی عادت ہے، دوسروں کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں، تو بچوں میں بھی یقینی طور پر یہ صفات پیدا ہوں گی۔

بچوں کو اس کی بہت ضرورت ہوتی ہے کہ گھر میں نہ صرف ان کے لیے بلکہ سب کے لیے کچھ اصول وضوابط طے شدہ ہوں، پھر جب کبھی بچے ان حدود وقواعد کی خلاف ورزی کریں تو والدین کو فوراً پریشان نہیں ہونا چاہیے، بچہ کہے کہ میں ''آپ کو پیار نہیں کرتا'' تو بالکل پریشان نہیں ہونا چاہیے، ایسے مواقع پر اہم بات یہ ہے کہ بچوں کو اپنے احساسات کے بیان وترجمان کا مکمل موقع دینا چاہیے، اگر چیخنے، جھڑکنے اور اپنے پیروں سے ڈھکیلنے پر آمادہ ہو پھر بھی پیار سے کھینچ کر اس کے گلے لگانا چاہیے لیکن ساتھ ہی ساتھ متعین اصولوں کی پابندی پر توجہ مرکوز رکھنا چاہیے، اگر اس حکیمانہ انداز سے تربیت کی جائے گی تو یقیناً اس کے بہت زیادہ اور بہت اچھے اثرات دیکھنے کو ملیں گے۔

کچھ والدین کے تبصرے:

☆ میں جب کسی سخت موقف سے دوچار ہوتا ہوں اور کسی سنگین مشکل کو حل کرنا چاہتا ہوں تو میں بچہ کو کچھ اختیارات (Option) دیتا ہوں، کبھی اس طرح کہتا ہوں ''اگر تم انتخاب نہیں کرو گے تو پھر میں تمہارے لیے کچھ منتخب کروں گا''۔

☆ میں نے اس سے کہا کہ اپنے بالوں کو پانی سے نہ بھگوئے، لیکن اس نے ایسا ہی کیا، اب بجائے اس کے کو وہ کہانی پڑھ سکے اس کا پورا وقت بال سکھانے میں گذر جائے گا، ظاہر ہے کہ اس کو کہانی پڑھنے کو نہیں ملی، اس کو یہ نقصان اسی کے عمل کے نتیجہ میں ہوا۔

☆ میرے بچے بیڈ روم میں کھیلتے ہیں، خوب شور مچاتے ہیں اور ہنگامہ کرتے ہیں، کبھی کبھی تو ایسا لگتا ہے کہ ان کی دھما چوکڑی میں کمرے کی چھت ہی گر پڑے گی، میں برابر کے کمرے میں بیٹھی رہتی ہوں اور مجھے بڑا غصہ آتا ہے، میں نے ارادہ کیا میں جا کر ہمیشہ کی طرح ان کو روکوں ٹوکوں لیکن پھر میں نے خود سے ہی سوال کیا

''ان بچوں کے اس فعل اور برتاؤ کا نتیجہ کیا ہوسکتا ہے''، پھر میں کچھ سوچ کر بہت پرسکون انداز میں ان کے پاس گئی اور کہا ''تم لوگوں نے اس قدر دھما چوکڑی نہ کرنے اور شور نہ مچانے کا وعدہ کیا تھا لیکن پھر بار بار تم لوگ وہی کر رہے ہو، لہٰذا یا تو تم لوگ باہر جا کر کھیلو یا پھر جوتے اتارو، کپڑے بدلو اور اب کھانے کے لیے تیار ہو جاؤ''، میں ان کو یہ آپشن دے کر چپکے سے کمرے سے نکل آئی، وہ سب سمجھ گئے کہ میں نے جو کہا ہے اسی پر عمل کروں گی، چنانچہ ان سب نے کپڑے بدلے، رات کا کھانا کھایا اور پھر لیٹ گئے اس طرح بقیہ تمام رات پرسکون گذری۔

☆ میں نے بار بار سزا دینے کا طریقہ اپنایا، میں نے دیکھا کہ بچے کی کمزوری میں اضافہ ہوا، اس کو یہ بھی گمان ہوگیا کہ وہ جب بھی کوئی کام کرے گا میں اس کو سزا دوں گا، اس لیے انسان کو سزا دینے میں بہت محتاط ہونا چاہیے، خاص طور پر جب نوعمر لڑکوں سے معاملہ کرنا ہو تو مزید احتیاط برتنا چاہیے، اب جس طریقہ سے مجھے بہت مدد ملتی ہے وہ یہ ہے کہ میں جب بھی بچے کے ساتھ کچھ کرنے کا ارادہ کرتا ہوں تو خود سے سوال کرتا ہوں کہ ''کیا میرا یہ اقدام بچے کو مزید ذمہ دار بنانے میں معاون ثابت ہوگا، چنانچہ اگر مثبت لگتا ہے تو کرتا ہوں ورنہ چھوڑ دیتا ہوں''۔

☆ میری بیٹی تین دن مسلسل شام کو تاخیر سے آئی، میں نے اسے تین آپشن دیے، پہلا یہ کہ وہ جب بھی لیٹ آئے گی تو میں اس کی سہیلیوں کے گھر جا کر اس کے تاخیر سے آنے کی وجہ معلوم کروں گی، دوسرا یہ کہ اس کی سہیلیاں جب اس کو بلانے آئیں گی تو تب تک اس کو جانے کی اجازت نہیں ہوگی جب تک مجھے یہ یقین نہ ہوجائے کہ وہ وقت مقرر پر لوٹ آئے گی، تیسرا یہ کہ وہ ایک ہفتہ تک اب گھر ہی میں رہے گی سہیلیوں کے یہاں نہیں جائے گی، چونکہ اپنی سہیلیوں کے سامنے اس کو سبکی ہوتی اس لیے اس نے ایک ہفتہ تک گھر میں رہنے کے آپشن کو قبول کیا، میں نے بھی زیادہ گفتگو نہیں کی بس بات کو مکمل طور پر واضح کر دیا، اس کو بھی اس کا اندازہ ہوگیا کہ میں جو کہہ رہی ہوں اس پر سختی سے عمل کروں گی۔

☆ جب ہم روز زید کے گم شدہ جوتے تلاشتے تو ہم سب کو صبح بڑی دشواری کا سامنا کرنا پڑتا تھا، ہم نے اس کو اس کے حال پر چھوڑ دیا کہ وہ اپنی کرنی کا مزا خود چکھے، اپنی ضروری چیزوں کو خود تلاشے، رفتہ رفتہ اب پہلے کی بہ نسبت وہ بہت کم غفلت برتتا ہے۔

☆ میں نے بیٹی سے کہا: ''اگر اب تم بستر سے اتر کر بھاگو گی تو کل تم کو اس کے بدلہ اور جلدی سونے کے لیے لیٹنا پڑے گا''، لیکن پھر بھی وہ دوبارہ اتر کر بھاگی، آئندہ شام کو اس نے میری رائے تبدیل کرنے کے لیے پہلے ہی سے رونا دھونا شروع کر دیا لیکن میں اپنی رائے پر اٹل رہی اور اس کے جلدی لیٹنے کے علاوہ کوئی چارہ نہ رہا، اس نے سمجھ لیا کہ اگر وہ دوبارہ ایسا کرے گی تو پھر یہی معاملہ بطور نتیجہ اس کو جھیلنا پڑے گا، اس طرح یہ مسئلہ بالکل قابو میں آ گیا۔

☆ میں نے سعید کو اس کی بہن فاطمہ کے حصہ میں سے مٹھائی کا ایک پیس دے دیا، کیونکہ فاطمہ نے اس کے حصہ میں سے ایک ٹکڑا لے لیا تھا، اس وجہ سے فاطمہ بہت پریشان ہوئی اور روئی لیکن درحقیقت اسی سے اس نے ایک نیا تجربہ حاصل کیا اور نئی چیز سیکھ سکی۔

جدول نمبر -٦

اس جدول سے معلوم ہوگا کہ بچوں کو اپنے اعمال کے نتائج کو برداشت کرنے کا عادی کس طرح بنایا جائے، اور یہ عمل کس طرح شروع کیا جائے، جدول پر نظر ڈالتے وقت آپ غور کیجئے کہ ان مثالوں کو آپ کس طرح اپنے گھر پر منطبق کر سکتے ہیں۔

مشکل	عام رویّہ	نتائجِ عمل کے طریقہ کا استعمال	نتیجہ
صبح پکارنے پر بھی بچہ نہیں اٹھتا۔	عام طور پر چیخ پکار ہوتی ہے، بار بار اس کو ڈرایا دھمکایا جاتا ہے، یاد دہانی کرائی جاتی ہے اور ناپسندیدگی کا اظہار کیا جاتا ہے۔	بچے کو ایک مرتبہ آواز دیجئے، یا اس کو ایک الارم گھڑی دے دیجئے، ممکن ہے کہ وہ اسکول کچھ دیر سے پہنچے گا، یا اگر ضرورت ہوئی تو بغیر ناشتہ کے اسکول جائے گا، چھٹی کے دن پوری فیملی کا ایک ساتھ ناشتہ کرنا طے ہوگا، اس دن جو لیٹ ہوا اس کو دوپہر کے کھانے کا انتظار کرنا ہوگا۔	وہ جلد ہی صبح سویرے اپنی ذمہ داری پوری کرنا شروع کر دے گا۔
بچہ بار بار اپنی ضرورت کی چیزیں بھول جاتا ہے۔	عام طور پر اس کو بار بار یاد دہانی کرائی جاتی ہے، اس پر غصہ کیا جاتا ہے اور کبھی اس کی چیزیں تلاش کی جاتی ہیں۔	بچے کو چھوڑ دیجئے کہ اگر وہ اپنا کھانا یا کتابیں بھول کر جاتا ہے تو اس کا نتیجہ بھگتے، اگر معاملہ ایسا ہو کہ اس کے بھولنے کی زد والدین پر پڑے تو پہلے ہی بچے سے بھولنے کے نتائج کو جھیلنے سے متعلق معاہدہ کر لیا جائے۔	وہ عنقریب اپنی ضروریات کو خود ہی یاد رکھنے کا عادی ہو جائے گا۔
بچہ پراگندہ حال رہتا ہے، نہ بال درست رکھتا ہے نہ کپڑے درست رکھتا ہے۔	ہمیشہ ماں باپ طے کرتے ہیں کہ وہ کیا پہنے، کیا خریدے اور کس طرح بال صاف ستھرے رکھے۔	بچے کو موقع دیجئے کہ وہ اپنے معاملات میں اپنی رائے دے، اس کو چھوڑ دیجئے کہ وہ سردی اور بارش کی ٹھنڈک میں کوٹ، سوئیٹر نہ پہننے کا نتیجہ خود جھیلے بجائے اس کے کوٹ پہنانے کے لیے اس کی خوشامد کی جائے، اگر والدین کو ساتھ نکلنا ہو تو وہ تاکید کر دیں کہ مناسب لباس پہنا جائے ورنہ راستہ میں اس کو دشواری ہوگی۔	وہ جلد ہی خود اختیار کرنا سیکھے گا، اپنے معاملات کے متعلق اپنی بات کہنے کا سلیقہ معلوم ہو جائے گا۔
بچہ پابندی سے دانت نہیں صاف کرتا ہے۔	اس کو یاد دہانی کرائی جاتی ہے، شرمندہ کیا جاتا ہے اور ناپسندیدگی کا اظہار کیا جاتا ہے۔	اس کو آپشن دیجئے کہ وہ دانت صاف کرے تبھی مٹھائی ملا کرے گی ورنہ نہیں، اب یا تو وہ دانت صاف کرے گا یا تو مٹھائی سے محروم رہے گا۔	وہ اپنی ذمہ داری سمجھ کر دانت صاف کرنے کی پابندی کرے گا۔
اس کے ذمہ جو گھر کے کام ہیں ان میں غفلت برتتا ہے۔	والدین یا تو یاد دہانی کراتے ہیں، یا ڈانٹ ڈپٹ کرتے ہیں، کبھی رشوت کا انداز اپناتے ہیں اور کبھی خود ہی اس کے ذمہ کا کام کرتے ہیں۔	سب نے آپس میں کام کو تقسیم کرنے پر اتفاق کیا، جو اپنا کام پورا نہ کرے اس کے نتائج کو جھیلنے پر بھی اتفاق کیا، بہتر نتائج تب ہوں گے جب اولاد قصور و خطا کے مصائب بھی برداشت کرے، مثلاً پلیٹ دھونا اس کے ذمہ تھا تو اگر اس نے پلیٹ نہیں دھوئی تو دوپہر کے کھانے میں تاخیر ہوگی۔	بچہ گھریلو کاموں میں شرکت کرنا اور گھر کے لوگوں کا ہاتھ بٹانا سیکھتا ہے۔
مقررہ وقت پر سونے میں غفلت یا تجاہل برتتا ہے۔	عام طور پر یاد دہانی کرائی جاتی ہے، زبردستی کی جاتی ہے، ڈانٹا جاتا ہے، سزا دی جاتی ہے۔	پہلے سونے کا ایک وقت متعین کیا جائے، اگر اس میں بچہ غفلت و تجاہل برتے تو آئندہ دو دن جلدی سونے کا پابند کیا جائے، وہ بار بار ایسا کرے تو ہر بار نئی مدت کا تعیین کی جائے، بچہ چھوٹا ہو تو اسے اختیار دیا جائے کہ وہ خود جا کر بستر پر لیٹے یا اسے اٹھا کر لٹا دیا جائے۔	وہ وقت پر سونے کو اپنی ذمہ داری سمجھے گا اور یہ سیکھے گا جو اصول وحد متعین ہو اس کو نافذ العمل کرنا ضروری ہے۔
بچہ اپنا ہوم ورک نہیں کرتا ہے۔	یا تو اس کو ڈرایا دھمکایا جاتا ہے، یا لکچر پلایا جاتا ہے یا پھر خود لگ کر اس کا کام پورا کرایا جاتا ہے۔	اس کے ہوم ورک کرنے پر توجہ دی جائے، کبھی لکھنے میں اس کی مدد کی جائے، ہوم ورک سے متعلق اس سے سوالات کیے جائیں، بقدر ضرورت اس کی مدد کی جائے، اگر پھر بھی وہ طے کر لے کہ نہیں لکھنا ہے تو پھر اس کو چھوڑ دیا جائے کہ وہ خود ہی کام نہ کرنے کا نتیجہ اسکول میں جھیلے۔	اس طرح وہ ہوم ورک کی ذمہ داری پوری کرنا سیکھے گا، اور والدین کے ساتھ اس کے تعلقات بھی مضبوط ہوں گے۔
چھوٹا بچہ مٹی اور بالو کھاتا ہے۔	اس کو بچایا جاتا ہے، ٹوکا جاتا ہے، روکا جاتا ہے، کبھی اس کو سزا بھی دی جاتی ہے،	بچے کو تھوڑی دیر کے لیے اس جگہ سے بہت اطمینان کے ساتھ دور کر دیجئے جس جگہ ریت اور مٹی ہو، وہ اگر پھر وہاں جا کر کھائے تو پھر ہٹا لیجئے، خواہ کتنی ہی مرتبہ ایسا کرنا پڑے مگر جب بھی وہ ایسی جگہ پہنچے آپ اس کو وہاں سے دور کر دیجئے۔	بچہ اس طرح مزید تنبیہ کے بغیر صاف ستھرا کھیل کھیلنا سیکھ لے گا۔

☆☆☆

❑

طلبہ مدارس کے نام ایک اہم پیغام

ترتیب وپیشکش: محمد عالم ندوی مرادآبادی

نوٹ: ''جس وقت پورے ملک میں مظاہرے جاری تھے، جامعہ ملیہ وعلی گڑھ کے طلبہ کے ساتھ ہوئی ظالمانہ کارروائی اور بربریت سے جذبات مجروح تھے، طلبہ میں غم وغصہ تھا، اس موقع پر ہمارے مہتمم جناب ڈاکٹر محمد طارق ایوبی صاحب نے طلبہ سے خطاب کیا، مجلس اگرچہ طلبہ کو گھر جانے سے پہلے ہدایات دینے کے لیے منعقد ہوئی تھی، اچانک اس مجلس میں جناب مہتمم صاحب نے جو گفتگو فرمائی اس میں ایک اہم پیغام اور بہت جامع مواد ہونے کے سبب ہم نے اسے عام کرنا اور نشر کرنا ضروری سمجھا، امید ہے کہ طلبہ مدارس اس سے فائدہ اٹھائیں گے، (محمد عالم)

حمد وصلوٰۃ کے بعد!

اعوذ بالله من الشيطان الرجيم

بسم الله الرحمن الرحيم

ولا تهنوا ولا تحزنوا وانتم الأعلون انی کنتم مؤمنین، ان تنصروا الله ینصرکم و یثبت اقدامکم۔

رفقائے گرامی قدر اور عزیزان گرامی:

جذبات کا ہونا بہت ضروری ہے لیکن جذبات پر قابو رکھنا اس سے بھی زیادہ ضروری ہے، ہماری پریشان یہ ہے کہ ہم جس ملک میں رہ رہے ہیں، اس ملک میں ہمیں ہر وقت بیدار رہنا تھا، اس ملک میں ہمیں ایک لمحہ بھی چین کے ساتھ نہیں ہونا تھا لیکن واقعہ یہ ہے کہ بہت افتاد پڑی ہمارے اوپر، بہت پریشان کیا گیا ہمیں وقتاً فوقتاً، فسادات کی مار جھیلی ہم نے، کئی مرتبہ اس ملک میں یہ ہوا کہ جہاں جہاں مسلمانوں کی معیشت مضبوط تھی وہاں وہاں اس طرح کے فسادات ہوئے کہ مسلمانوں کی معیشت کو تباہ کردیا گیا، برباد کردیا گیا، آپ اس کی مثال میں مرادآباد کا نام لے سکتے ہیں، جمشید پور کا نام لے سکتے ہیں، نام لے سکتے ہیں احمد آباد کا، آپ اس کی مثال میں نام لے سکتے ہیں سورت کا، آپ کی مثال میں نام لے سکتے ہیں ممبئی سورت اور پورے گجرات کا، یہ ہوتا رہا، ۱۹۴۷ء کے بعد جو بنیادی غلطی ہوئی اور جس غلطی کا ہم نے تسلسل کے ساتھ ارتکاب کیا، اس غلطی کے نتیجہ میں تسلسل کے ساتھ یہ سب کچھ ہوتا رہا، ضرورت اس بات کی تھی کہ ان حالات سے ہم فائدہ اٹھاتے اور ہم اس طرح اس ملک میں رہتے جس طرح مصر کو فتح کرنے کے بعد فاتح مصر حضرت عمرو بن العاصؓ نے لوگوں کو مخاطب کرکے کہا تھا، انتم فی رباط دائم، تم کو یہاں اس طرح رہنا ہے جس طرح سے ایک سپاہی سرحد پر چوکنا رہتا ہے، ایک منٹ کے لیے بھی اس کی آنکھ نہیں لگتی ہے، اس وقت ہمارے جذبات زندہ ہیں اور سچ پوچھئے تو ہماری آنکھوں میں خون اترا ہوا ہے لیکن یہ بھی ایک طوفان ہے گذر جائے گا، یہ بھی ایک آندھی کا جھونکا ہے چلا جائے

گا، پھر وہی رفتار بے ڈھنگی جو پہلے تھی پھر ہوگی، پھر وہی زندگی ہوگی وہی عیش کوشی ہوگی وہی طرب ہوگا، آج جو لوگ سڑکوں پر اپنی جانوں کا نذرانہ دینے کو تیار ہیں، دیوانے بن کر نکلے ہیں انھیں صد آفرین وصد مبارکباد مگر سچ یہ ہے کہ کل تک یہی لوگ تھے جو عیش وطرب میں مگن تھے، انھیں بھی ملک کی ایسی فکر نہ تھی جو ہونی چاہیے تھی، اس حقیقت کو ہمیشہ مدنظر رکھنا چاہیے، اس ملک میں ہمیں اس اعتبار سے جینا ہے کہ مستقبل میں قیادت ہماری ہو، مستقبل میں امامت ہماری ہو، مستقبل میں ملک کی باگ ڈور ہمارے ہاتھ میں ہو، اس کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ جب وقتی طور پر ہمارے سامنے کوئی مسئلہ درپیش ہو اس پر وقتی جوش اور جذبہ دکھانے کے بجائے جو احساسات بیدار ہوں، ان کو صحیح رخ دیا جائے، اگر بے قابو ہو کر آپ کسی بھیڑ کا حصہ بن جائیں تو آپ نقصان اٹھائیں گے، اس لیے کہ نہ آپ کے پاس حکومت ہے، نہ پولیس ہے نہ فوج ہے، نہ طاقت ہے، نہ یہ معلوم ہے کہ مظاہرہ کیسے کرنا ہے، ایسی صورت میں جب آپ بھیڑ کا حصہ بن جائیں گے تو نتیجہ کیا ہوگا، سوائے اس کے کہ آپ اپنے ہاتھ تڑوائیں گے، پیر تڑوائیں گے، اپنا خون بہائیں گے اور نتیجہ کچھ نہیں ہوگا، نتیجہ خیز مظاہروں کے لیے ضروری ہے کہ ہمیشہ بیدار رہیں، تیار رہیں اور تیاری کے ساتھ منصوبہ بند طریقے سے جمہوری انداز میں مظاہرے کریں، یہ مظاہرے جمہوریت کو بچانے کے لیے بہت ضروری ہیں، مگر ہمیں قربانی وہاں دینی ہے جہاں سے نتیجہ کی امید ہو، حالانکہ ہماری تعلیم یہ ہے کہ ہم نتائج پر کام نہیں کرتے، نتائج اللہ کے ہاتھ میں ہے، ہماری لاکھ قربانیوں کے بعد بھی نتیجہ مثبت ہوگا یا نہیں ہوگا یہ اللہ کے ہاتھ میں ہے، یہ ہمارا عقیدہ ہے، یہ ہمارا ایمان ہے۔

دیکھنا صرف یہ ہے کہ ہماری جو کوشش ہے وہ قرآن و سنت کے مطابق ہے یا نہیں ہے اگر قرآن وسنت کے مطابق ہے تو ہم آخری دم تک کوشش کرتے رہیں گے، چاہے اس کا نتیجہ ذرہ برابر نہ آئے لیکن جو کوشش ہماری ہوگی وہ نتیجہ کی امیدیں ہوگی، ہوتا یہ ہے کہ جب حالات پیدا ہوتے ہیں تو بھیڑ بے قابو ہو جاتی ہے، لوگ چل پڑتے ہیں، ان کو یہ معلوم نہیں ہوتا کہ کس لیے دوڑ رہے ہیں، کس کام کے لیے جا رہے ہیں، ہمیں کرنا کیا ہے، جب ہمیں معلوم نہیں کہ ہمیں کرنا کیا ہے، مقصد کیا ہے، نتیجہ کیا نکلے گا، رزلٹ کیا ہوگا تو سوائے نقصان کے اور کچھ نہیں ہوگا، اور عام طور سے مسلمانوں پر جو حالات آتے ہیں، ان میں مسئلہ یہی ہوتا ہے، میں آپ کو مثال دیتا ہوں کتنی بیدار مغزی کی بات ہے، تحریک کو صحیح رخ دینا، بروقت صحیح فیصلہ لینا، مثلاً آپ میں سے اکثر طلبہ نے سنا ہوگا کہ کل جامعہ ملیہ کے طلباء پر طالبات پر پولیس نے اپنی بربریت کا مظاہرہ کیا، بری طرح سے کمروں میں گھس گھس کر کے مارا، یہ سب کچھ ہوا، ایسی صورت میں ہونا کیا چاہیے تھا، طلباء ان سے ٹکراتے یا پیٹھ دکھا کر بھاگ جاتے، فوراً JNU کے طلباء نے یہ فیصلہ لیا اور پوری دلی میں فوراً یہ میسج عام کیا کہ سارے لوگ فوراً چپکے سے نکلیں، احتیاط سے نکلیں، اکٹھا ہو جائیں، دہلی پولیس ہیڈکوارٹر پر، JNU کے طلباء دہلی یونیورسٹی کے طلباء اور جامعہ کے طلباء اور دہلی کے عوام سب ہیڈکوارٹر پر جا کر جمع ہو گئے، اکٹھا ہونے کے بعد توڑ پھوڑ نہیں کی، پرسکون طریقہ سے جمع ہو گئے اور کہا ہمارے یہ مطالبات ہیں، یہ ایک زبردست فیصلہ تھا اس فیصلہ نے ان کی شکست کو روک دیا وہ نہتے تھے لیکن انھوں نے جمہوری طرز پر شکست کو روک دیا، اپنے جمہوری حق کا استعمال کیا، عقل کا استعمال کیا، ان کی فوری شکست رک گئی، گیند ان کے پالے میں پھینک دی گئی، عقل مند کی بروقت یہ کوشش ہوتی ہے کہ اپنے پالے کی حفاظت کرنا ہے اور گیند دوسرے کے پالے میں پھینکنا ہے، ہم سے اس سلسلہ میں ہمیشہ غلطی ہوتی ہے۔

بعض جگہ لوگوں نے یہ پیغام دیا کہ ترمیم شہریت کا قانون مسلمانوں کے خلاف ہے، یہ قانون صرف مسلمانوں کے خلاف نہیں ہے یہ دلتوں کے خلاف ہے یہ شودروں کے خلاف ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ یہ قانون آئین ہند کے خلاف ہے۔ یہ ہمارے سنودھان کے خلاف ہے، انڈیا کی روح

سیکولرزم کے خلاف ہے، اس کے خلاف بڑی طاقتور آوازیں غیر مسلموں کی طرف سے اٹھائی گئیں، ہم سے غلطی یہ ہوتی ہے کہ ہر مسئلہ کو ہندو مسلم کا رنگ دے دیا جاتا ہے، میں یہ باتیں اس لیے عرض کر رہا ہوں کہ ہمارے شاگردوں میں سے، ان لوگوں میں سے جو ہمارے زیر سرپرستی ہیں، میں یہ چاہتا ہوں کہ کل ان میں سے ایسے سوجھ بوجھ والے لوگ نکلیں جن کی زندگی کسی مسجد میں محدود نہ ہوں، جن کی زندگی محدود دائرہ میں نہ ہو، بلکہ جن کی زندگی معاشیات سے بھی جڑی ہوئی ہو قیادت و سیادت سے جڑی ہوئی ہو، سیاست سے جڑی ہو، وہ زندگی کے ہر میدان میں اپنے قائدانہ کردار اور ذمہ دارانہ وجود کا ثبوت دیں۔

اگر انھیں مستقبل میں اپنا ایسا کردار بنانا ہے تو اس کے لیے انھیں بیدار مغز بننا پڑے گا، انھیں تاریخ پڑھنی پڑھے گی، انھیں اس ملک میں بسنے والے لوگوں کی نفسیات کو جاننا پڑے گا، اس ملک میں بسنے والوں کے مذاہب کو جاننا پڑے گا، سیاست کی باریکیوں کو سمجھنا پڑے گا، بغیر جانے ہوئے، بغیر بوجھے ہوئے آپ نکل گئے تو آپ کو مار دیا جائے گا، یا خرید لیا جائے گا، مجھے بھی یہ سب کچھ پڑھایا نہیں گیا ہے لیکن الحمد للہ میں نے یہ سب سیکھا ہے اور بہت سے ایسے مواقع آئے ہیں جن مواقع پر میں نے آپ کہہ سکتے ہیں کہ شاطرانہ جواب دیئے ہیں، سیاسی جواب دیئے ہیں، جن کی ضرورت تھی وہ جواب دیئے ہیں اور سامنے والوں کو مطمئن کیا ہے، یہ سکھایا نہیں جاتا ہے، ہر چیز نصاب کا حصہ نہیں ہوتی ہے، یہ سیکھی جاتی ہے، معاشرت سے سیکھی جاتی ہے، مطالعہ سے سیکھی جاتی ہے، تاریخ کا مطالعہ خاص طور پر کر کے اسے سمجھا جاتا ہے۔ میں آپ سے یہی تو کہتا ہوں آپ اس ملک کی تاریخ سے واقفیت حاصل کیجئے، اس ملک میں جو لوگ بستے ہیں ان کے مزاج سے واقف ہونے کی کوشش کیجئے، ان کے مذہب سے وقفیت حاصل کیجئے، ظاہر ہے کہ خارجی وقت میں آپ کو اس کے لیے مطالعہ کرنا پڑے گا، آپ کو اپنی زندگی سے لاابالی پن کو نکالنا پڑے گا۔

جو حالات ہیں وہ انتہائی خطرناک ہیں، انتہائی تشویش ناک ہیں، کل کیا ہونے والا ہے کوئی بتا نہیں سکتا، جس رخ پر ملک کے حالات ہیں وہ زبان حال سے یہ کہہ رہے ہیں کہ ہم محفوظ ہیں یا نہیں ہیں، نہیں کہہ سکتے، ہمارے اہل خانہ محفوظ ہیں نہیں ہیں، نہیں کہہ سکتے، ہمارے گھر کی عورتوں کی عصمتیں، عزتیں محفوظ ہیں نہیں محفوظ ہیں، ہم نہیں کہہ سکتے، لیکن اللہ سے دعا کرتے ہیں کہ اللہ ہمارے گناہوں کی سزا ہمیں نہ دے، ہم بہت کمزور ہیں، اللہ ہم پر رحم فرمائے، اور ہم یہ عزم کرتے ہیں کہ آئندہ ہم بیدار مغزی کے ساتھ ہمہ جہت محنت کریں گے، اگر ہم نے اب بھی محنت نہیں کی، اب ہم نے ہمہ جہت کوشش نہیں کی، اگر اب ہم نے سیکھنا نہیں شروع کیا، حالات کے طوفان سے، حالات کے درمیان سے مصائب کے درمیان سے تجربات حاصل کرنے اور سیکھنے کا جو عمل ہوتا ہے پھر اس کو استعمال کرنے کا جو عمل ہوتا ہے وہ اگر ہم نے نہیں کیا تو مستقبل بہت تاریک ہے، میں نے ابھی دیکھا ہے، اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے لوگ بے قابو ہیں، لوگوں کے اندر جذبات ہیں، ہم ان کے جذبات کو Blaim نہیں کر سکتے، یہ ہماری کمی ہے کہ آج ہم دس سال سے یہاں رہ رہے ہیں، ہمیں لوگ پہنچانتے نہیں ہیں، ہمیں دیکھ کر کے لوگوں کو رک جانا چاہیے تھا، یہ ہماری کمی ہے، ان کے جذبات اپنی جگہ پر درست ہیں، اور اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حمیت وجود ہے، غیرت موجود ہے، مزاج میں، ان کے اندرون میں کہیں نہ کہیں قومی مزاج، قومی حمیت، ملی حمیت موجود ہے، لیکن مجرم ہم ہیں، غلطی ہماری ہے، ہم نے ان کے جذبات کو صحیح رخ دینے کا کام نہیں کیا، ہمارا ان سے رابطہ نہیں ہے، وہ ہمیں نہیں پہچانتے ہیں، ان کو ہم نہیں پہچانتے، ہم ان کو Blaim کرتے ہیں کہ ان کی زندگی صرف کھانے کمانے تک محدود ہے، یہ بالکل غلط رویہ ہے۔

Blaim ہمیں اپنے آپ کو کرنا چاہیے، الزام اپنے آپ کو دینا چاہیے، ہم بھی یعنی ہم مدرسہ والے صرف اپنی ڈیوٹی پر جمے ہوئے ہیں، بس جتنی دیر ہمیں ڈیوٹی کرنی ہے ڈیوٹی

کرتے ہیں، جہاں ہمیں خاص طور پر بلایا جائے، بڑی عزت دی جائے، بڑے اہتمام سے بلایا جائے وہاں ہم جانے کے لیے تیار ہیں، لوگوں سے ہمارا رابطہ نہیں، عوام سے ہمارا کوئی رابطہ نہیں، ہم ان کے جذبات کو صحیح رخ نہیں دے سکتے، ہم یہ شکوہ کرتے ہیں کہ وہ آتے نہیں، شکوہ یہ ہے کہ ہم جاتے نہیں، ہم ملتے نہیں، ہمارا رابطہ نہیں عوام سے، ان کے جذبات کو ان کی حمیت کو صحیح رخ دینے کی آج تک ہمیں توفیق نہیں ہوئی، کیونکہ ہمارے اندر خود جذبات سرد پڑے ہوئے ہیں، ہم خود ڈھیلے ڈھالے، ہر وقت یہ سوچتے ہیں کچھ ہوتا نہیں ہے، کچھ ہوگا تو کیسے ہوگا، ایسا کیسے ہوگا، ویسا کیسے ہوگا۔

اب اس وقت جو صورت حال پیش آئی ہے، یہ صورت حال ہم سے مطالبہ کرتی ہے کہ ہم آئندہ کے لیے، مستقبل کے لیے ایک لونگ ٹرم پالیسی (Long Term Policy) بنائیں، ایک طویل المیعاد منصوبہ بنائیں، اپنے آپ کو قربانیوں کے لیے تیار کریں، قربانیاں ہر طرح کی دینی پڑیں گی کبھی جسم کے ساتھ دینی پڑیں گی، کبھی آنکھوں کی بیداری کے ساتھ دینی پڑے گی، کبھی مال کی دینی پڑے گی، کبھی بھوکے رہنے کی دینی پڑے گی، ہر طرح کی قربانی دینی پڑے گی لیکن قربانی دینے کے ساتھ جب طویل المیعاد، لمبی مدت تک کا کوئی منصوبہ بنائیں گے اور منصوبہ کے تحت کام کریں گے، ماضی میں جو تجربہ کیا گیا ہے، ان تجربات کی روشنی میں، کہاں ہم سے غلطی ہوئی، کہاں ہم سے کوتاہی ہوئی ہے، کونسا تجربہ ہمارا کامیاب رہا؟ کونسا تجربہ ہمارا ناکام رہا؟ جب ہم اس کی روشنی میں اپنے مستقبل کے لیے لائحۂ عمل طے کریں گے تو ان شاء اللہ یہ امید ہے کہ مستقبل پھر تابناک ہوگا، مستقبل کے حالات ہمارے موافق ہونگے، اگر اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق اس کی شریعت کے مطابق، فیصلے کریں اور اپنے مسائل کو حل کریں تو حالات بدلتے چلے جائیں گے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ جب شریعت کا نام لیا جاتا ہے تو ہماری شریعت صرف عبادت تک محدود ہوتی ہے، ڈاڑھی اور ٹوپی تک محدود ہوتی ہے، مجھے معاف کیجئے، یہاں بہت سے علماء بیٹھے ہوئے ہیں، ہمارا تصور شریعت تسبیح ومناجات اور نماز وروزہ سے آگے نہیں بڑھتا اور اگر کچھ آگے بڑھتا ہے تو بقرعید کی قربانی تک ہماری شریعت محدود ہوتی ہے، باقی مسائل، قومی مسائل، ملی مسائل، سیاسی مسائل وہ کس قانون کی روشنی میں طے کیے جائیں گے، گیتا کی روشنی میں طے کیے جائیں گے؟ کس چیز کی روشنی میں طے کیے جائیں گے؟ آخر کون ہے جو ہماری رہنمائی کرے گا؟ کس طرح ہمیں اس ملک میں زندگی گزارنا ہے؟ کس طرح اس ملک میں اپنی کشتی کو آگے بڑھانا ہے؟ کس طرح سے ہم اس ملک میں آگے جائیں گے؟ یہ بھی ہمیں قرآن وسنت کی روشنی میں ہی طے کرنا ہے، جب ہم قرآن وسنت کی روشنی میں طے کریں گے، ان خطوط پر آگے بڑھیں گے تو حالات کی تبدیلی یقینی ہے، ہم قرآن پڑھتے ہیں قرآن میں یہ بشارتیں پڑھتے ہیں کہ ''اللہ کی پارٹی کے لوگ ہی غالب ہوں گے''۔ کیسے غالب ہوں گے؟ پہلے حزب اللہ میں شامل ہونا پڑے گا جب حزب اللہ میں ہی ہمارا شمار نہیں ہے تو غلبہ کیسا؟ ہم عوام کے سامنے تقریریں کرتے ہیں لچھے دار ولا تھنوا ولا تحزنوا وانتم الاعلون ان کنتم مومنین پہلے حصہ کی تشریح کی جاتی ہے، دوسرے حصہ جو شرط ہے ان کنتم مومنین پہلے مومنین میں ہمارا شمار تو ہو، کیا مومنین میں ان شکلوں کے ساتھ ہمارا شمار ہوگا؟ کیا مومنین میں صرف ان سجدہ کے نشانیوں سے شمار ہوگا، کیا مومنین میں صرف ان ٹوپیوں کے ساتھ شمار ہوگا، پہلے مومنین میں ہم اپنا شمار تو کرائیں، صاف بات یہ ہے جو تفسیر کے طلبہ سے بار بار میں کہتا ہوں کہ صحیح بات تک پہنچنے کے لیے ضروری ہے کہ ایک موضوع کی تمام آیات کو جمع کر کے ان پر غور کیا جائے، چنانچہ جب اس طرح کی تمام بشارتوں کو آپ سامنے رکھیں گے اور اس کے بعد آپ نتیجہ اخذ کرنے کی کوشش کریں گے تو نتیجہ یہ نکلے گا، ان تنصروا اللہ ینصرکم و یثبت اقداکم شرط یہی ہے، نتیجہ یہی ہے اگر تم اللہ کی مدد کرو گے یعنی اللہ کے دین کی مدد کرو گے، اللہ کی

شریعت کی مدد کرنے کے لیے اللہ کے احکام کی مدد کرو گے تمہارا معاشرہ اسلامی ہوگا، تمہاری زندگی اسلامی ہوگی، تمہاری معیشت اسلامی ہوگی، تمہاری نسل اسلامی ہوگی، زبانیں اسلامی ہوں گی، تمہارا دل اسلامی ہوگا، تمہارا دماغ اسلامی ہوگا، تمہارے اعضاء سے نکلنے والے اعمال اسلامی ہوں گے جب یہ چیزیں اسلامی ہوں گی سب کی سب اسلامی ہوں گی تو پھر بات بنے گی، تو پھر یہ شرط پوری ہوگی تب اس کی جزا ملے گی، اس سے نتیجہ نکلے گا، اس کا بدلہ ملے گا، آج طے کیجئے کہ ان حالات میں جو شعور بیدار ہوا ہے ان حالات میں جو لوگوں کا احساس بیدار ہوا ہے، ہم کو اسے استعمال کرنا ہے، اس کو استعمال کرنے کا اپنے آپ کو اہل بنانا ہے، اپنے اندر وہ صلاحیت پیدا کرنی ہے، اب تک ہم سے جو کوتاہی ہوئی ہے، اس کوتاہی سے ہمیں توبہ کرنا ہے، اب ہمیں اس ملک میں زندگی اسی طرح گزارنی ہے کہ انتم فی رباط دائم کو ہم سرحد کے چوکی دار ہوں گے، ہم سرحد کے سپاہی ہوں گے، ہم ہر وقت فکرمندی کے ساتھ اور بیدار مغزی کے ساتھ رہیں گے۔

اب ہم آگے بڑھیں گے، اس ملت کی قیادت کریں گے، اس قوم کو آگے بڑھائیں گے، اپنے آپ کو تیار کریں گے، یہ موقع ہمیں اپنے آپ کو تیار کرنے کا ملا ہے، طوفان آئیں گے، ٹل جائیں گے، عقلمند وہی ہوگا جو ان طوفانوں کے تھپیڑوں سے بچ کر نکلے گا اور پھر نئے عزم و حوصلے کے ساتھ کھڑا ہوگا، آپ یہ طے کیجئے آپ مستقبل کے حسین احمد مدنی بنیں، آپ یہ طے کیجئے کہ آپ ریشمی رومال تحریک کے بانی بنیں، آپ کانگریس کی صدارت کرنے والے ابوالکلام آزاد بنیں، آپ ٹکڑوں کی طرف مت دیکھئے، بھیک مت مانگئے، آپ کے سامنے نمونہ ہے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا، آپ کے سامنے نمونہ ہے خلفائے راشدین کا اور اس ہندوستان میں ابوالکلام آزاد کا جن کے بارے میں شیخ الہند کی مجلس میں تذکرہ کیا گیا تو آپ نے فرمایا بس کرو بھائی اس نوجوان نے ہم سب سورہے تھے، سب کو جگا دیا ہے، ایک نوجوان ابوالکلام نے اپنے الہلال والبلاغ سے ایسا ماحول پیدا کیا کہ شیخ الہند اس کے بارے میں یہ فرماتے ہیں، اس نے ہمیں جگا دیا، آپ کے سامنے نمونہ ہے، مسلم مجلس مشاورت کے لیے اپنی ایک آنکھ کی قربانی دینے والے ابوالحسن علی ندوی کا، آپ ان نمونوں کو اپنے سامنے رکھئے اور پھر مستقبل کا لائحہ عمل طے کیجئے اور محنت کیجئے، مت سنئے کسی کی، مت کسی سے بھیک مانگئے، آپ اپنے آئیڈیل کو سامنے رکھئے اور اپنی زبانوں کو تیار کیجئے، اپنے قلم کو تیار کیجئے، آپ شارپ مائنڈ بنیے، آپ ہر وقت سوتے رہیں، آپ کو اپنے سامنے کی چیزوں کا علم نہ ہو، اپنے گردوپیش تک سے آپ واقف نہ ہوں، ایسی صورتحال میں آپ کو مظاہرہ کی اجازت دے دی جائے تو آپ پٹ پٹا کر چلے آئیں گے، یہ موقع آپ کو تیاری کے لیے ملا ہوا ہے، اپنے آپ کو تیار کیجئے، آپ یہ دیکھئے کہ ان حالات سے امید کتنی بندھ رہی ہے اور لوگوں میں بیداری کیسی آرہی ہے، اس وقت جو اپنے آپ کو تیار کرے گا اور مستقبل میں محدود دائرہ میں سے باہر نکل کر کے کام کرے گا وہی مرد میدان ہوگا، یہ سوچنا بند کر دیجئے کہ ہم کیا کریں گے، آپ جب کرنے پہ آجائیں گے خدا کی قسم راہیں آپ کے لیے کھلتی چلی جائیں گی، کھلتی چلی جائیں گی ایک کاشی رام اٹھا تھا سائیکل پہ چلا کرتا تھا، پیدل چلتا تھا پھر سائیکل پر چلتا تھا، لائی اور چنے دن بھر کھایا کرتا تھا، کبھی ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کے در پے جبہ سائی کرتا تھا، کبھی علی میاں کے پاس جاتا تھا، ان سے ملاقاتیں کرتا تھا، اس سے بھی ہمارے قائدین نے ہمارے علماء نے ہمارے مسلمانوں نے سبق نہیں لیا، اس حالت میں اس نے دورے کئے سالہا سال تک، حتی کہ جن کو شودر کہا جاتا تھا، جن کو ہریجن کہا جاتا تھا، اس نے ان کو وزیر اعلیٰ بنا کر بیٹھا دیا اور پھر اسی اتر پردیش میں ہریجن ایکٹ اس نے بنوالیا، آپ ہریجن کو چھو کر کے دیکھئے کیا حال ہوگا پھر آپ کا، تو یہ صورت حال ہے، یہ موڈل ہے، ہم کریں کیسے؟ ہم کرنے پہ آتے نہیں ہیں، اس لیے یہ سوال ہم کو پریشان کرتا ہے، آپ کی عمر ہے، جب تک

انسان کی شادی نہیں ہوتی جب تک انسان کے بچے نہیں ہوتے ہیں، جب تک اس کے اوپر گھریلو ذمہ داریاں نہیں ہوتیں ہیں جب تک وہ بہت کچھ کرسکتا ہے، جب وہ گھریلو ذمہ داریوں میں گھر جاتا ہے تو پھر اس کے سامنے ہر وقت نمک مرچ کا مطالبہ ہوتا ہے، ہر وقت اس کے چھوٹے چھوٹے معصوم بچوں کا بلکنا اور رونا ہوتا ہے، بہت ساری الجھنیں اس کے سامنے ہوتی ہیں، میں یہ نہیں کہتا کہ ایسے لوگ کچھ کر نہیں سکتے، کرنے والے آج بھی کر رہے ہیں اور ان شاء اللہ آئندہ بھی کریں گے، لیکن جو نوجوان میں جو نیا خون ہے حسن کے اوپر ابھی گھریلو ذمہ داری نہیں ہے، وہ عہد کریں کہ ان حالات میں ہم اپنے آپ کو تیار کریں گے، اپنے جذبات کو قابو میں رکھیں، اپنی عقل کا استعمال کریں اور وہ اس یقین کے ساتھ اٹھیں اور یہاں سے جائیں مسجد میں اللہ کے سامنے روئیں، اللہ کے سامنے گڑگڑائیں یا اللہ یہ امت بڑی کمزور ہے یا اللہ اس امت میں مصائب کو جھیلنے کا اور آزمائشوں سے گذرنے کا یا اللہ اس امت میں نہ سلیقہ ہے اور نہ ابھی یہ اس لائق ہے، یا اللہ اسے ان سخت آزمائشوں سے نجات دے دے، یا اللہ ہم توبہ کرتے ہیں، یا اللہ ہم تیرے سامنے اپنے گناہوں کا اعتراف کرتے ہیں، یا اللہ ہم آج سے یہ عزم کرتے ہیں، یا اللہ ہم تیار ہوں گے، اپنے آپ کو تیار کریں گے، بس تو اپنی توفیق شامل حال کردے، یا اللہ ہم ہمہ جہت اسلام کی خدمت کریں گے، ہم اس ملک میں اسلام کے پھریرے لہرائیں گے، یا اللہ ہم اس ملک کے ایک ایک باشندے تک ایک ایک شخص تک قرآن کا تعارف پہنچائیں گے، حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا تعارف پہنچائیں گے، میرے عزیز وصرف یہی ایک ذمہ داری اگر اس ملک کے علماء اس ملک کے طلبہ اور مدارس کے لوگ پوری کرلیں تو خدا کی قسم اسلام کو پھیلنے سے اور مسلمانوں کی اکثریت ہونے سے اس ملک میں کوئی نہیں روک سکتا ہے، اسلام کی سرشت میں یہ بات داخل ہے کہ جب جب اس کو دبایا جائے گا تب تب وہ ابھر کر سامنے آئے گا، آپ پڑھ لیجئے سروے رپورٹ ورلڈ ٹریڈ سینٹر کا جب واقعہ پیش آیا اور مسلمانوں کو تہہ تیغ کیا گیا پوری تاریخ انسانی میں سب سے زیادہ قرآن کے نسخے اگر کبھی فروخت ہوئے ہیں اور کبھی چھپے ہیں تو وہ ورلڈ ٹریڈ سینٹر کے واقعہ کے بعد اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ آپ اللہ کے سامنے رجوع کیجئے، اللہ کے سامنے خشیت کا اظہار کیجئے، یہ طے کیجئے کہ میدان صرف مدرسہ کا نہیں ہوگا، میدان صرف مسجد کا نہیں ہوگا، میدان سیاست کا ہوگا، میدان تجارت کا ہوگا، تعلیم وتعلم کا ہوگا، رفاہی خدمات کا ہوگا، دعوت وڈائیلاگ کا ہوگا، ہر شعبہ میں محنت کر کے اس ملک کی قیادت اپنے ہاتھ میں لی جائے گی، محدودیت کا لبادہ اتار کر پھینک دیا جائے گا، دنیا کو بتایا جائے گا کہ علماء نبوت کے چشمۂ حیواں سے سیراب ہوکر ہر پہلو سے انسانی زندگی کی آبیاری کرتے ہیں اور بنی نوع انسان کے ہر طبقہ کو سیراب کرتے ہیں، ایک ایک طالب علم یہ طے کرے کہ ہم کو آئندہ اس قوم کی رہنمائی کے لئے آج اپنے آپ کو لگا دینا ہے، کیسا کھانا کیسا پانی کیسی نیند، اگر آپ کہتے ہیں کہ آپ کے اندر جذبات ہیں، اگر آپ کہتے ہیں کہ آپ کے اندر جذبات جوان ہیں، اگر آپ کہتے ہیں کہ آپ کے اندر ملی غیرت ہے، اگر آپ کہتے ہیں کہ آپ کا دل کر رہا ہے مظاہرے کرنے کا تو مستقبل کے مظاہرے کے لیے اپنے آپ کو تیار کیجئے، مستقبل میں آزمائشوں کے لیے اپنے آپ کو تیار کیجئے اس وقت آپ کا جو کام ہے اس کام میں لگ جایئے، یہ مختصر باتیں تھیں جو آپ کے سامنے رکھنی تھیں، امید ہے کہ آپ مدعا سمجھ گئے ہوں گے اور مستقبل میں ملت اسلامیہ کی اور اسلام کی ہمہ جہت خدمت کے لیے، قیادت کے لیے اپنے آپ کو تیار کرنے کی کوشش کریں گے، اللہ ہم سب کا حامی و ناصر اور معین ومددگار ہو، والسلام علیکم۔

واٰخر دعوانا ان الحمد لله رب العالمين۔

☆☆☆

❑ تاریخ کے جھروکوں سے

''ہندوستان کے عہد ماضی میں
مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری-جلد دوم'' ایک مطالعہ
(مصنفہ سید صباح الدین عبدالرحمٰنؒ)

ڈاکٹر محمد طارق ایوبی

''ہندوستان کے عہد ماضی میں مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری'' کی دوسری جلد میں مصنف نے عہد مغلیہ کے فرمانروا بابر، ہمایوں، شیر شاہ سوری، اسلام شاہ، اکبر، جہانگیر اور شاہ جہاں کے عہد کی انسانیت دوستی، کشادہ قلبی اور مذہبی رواداری کی مدلل تاریخ رقم کی ہے، مصنف کا نظریہ ہے کہ اگر مؤرخ کی نیت صحیح ہو تو وہ متنازع فیہ موضوع میں بھی روشن پہلو دکھا سکتا ہے، مصنف نے اپنی اس بات کے ثبوت میں ایک دلچسپ اشارہ کیا ہے، آزادی کے بعد سے ملک میں بے شمار ہندو مسلم بلوے ہوئے ہیں، (انھوں نے اس وقت تک کے اعداد وشمار بھی ذکر کیے ہیں) مگر کیا جب اس دور کی تاریخ لکھی جائے گی تو صرف ان بلووں اور دنگوں کو پیش کیا جائے گا، ظاہر ہے کہ ان کے ساتھ ساتھ یکجہتی و یگانگت اور محبت و بھائی چارے کی داستان بھی رقم کی جائے گی، آزادی کے بعد ملک میں بعض مورخین کی طرف سے نفرت انگیزی کے لیے جو کوششیں کیں ان کے پیش نظر مصنف نے اس کتاب میں معروضیت اور تاریخی حقائق کو ملحوظ رکھتے ہوئے معاشرے میں رواداری کے جذبات فروغ دینے کے لئے اچھا مواد جمع کر دیا ہے، بسا اوقات لوگوں کو مصنف کا انداز دفاعی یا اعتذار پسند معلوم ہوسکتا ہے لیکن خالی الذہن ہوکر مطالعہ کرنے سے یہ وہم جاتا رہے گا۔

مصنف نے کتاب کی ابتدا **ظہیر الدین بابر** کے تذکرے سے کی ہے، انھوں نے سب سے پہلے بابر کی وصیت کے طور پر جو عبارت نقل کی ہے وہ مختلف تاریخ کی کتابوں میں نقل کی گئی ہے، ڈاکٹر راجندر پرشاد اور پروفیسر سری رام نے بھی اس کو نقل کیا ہے، اگر چہ یہ عبارت جو بابر نے ہمایوں کو نصیحت کرتے ہوئے لکھی ہے ''تزک بابری'' میں نہیں ہے تاہم مکمل طور پر اس سے انکار ممکن نہیں اس لیے کہ جس رواداری بے تعصبی اور انسان دوستی کی اس میں نصیحت کی گئی ہے تاریخ کا غیر جانبدارانہ مطالعہ بتاتا ہے کہ وہ بابر میں تھی، اس نے رانا سانگا کے خلاف خوں ریز جنگ کی مگر اس کے خاندان کے ساتھ جو رودارانہ سلوک کیا اس پر تاریخ گواہ ہے، وہ گوالیار کے مندر کی سیر کا حال بیان کرتا ہے تو اس پر مصنف یہ خوبصورت تبصرہ کرتے ہیں:

> **''وہ بت شکن ہونے کے بجائے جس طرح مزے لے لے کر اس بت خانہ کا ذکر کرتا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ طے کر چکا تھا کہ جہاں بانی میں اس کو اس قسم کی رواداری کا اظہار کرنا ضروری ہے''۔(ص۹)**

اس کے بعد مصنف نے **ہمایوں** کا مختصر تذکرہ لکھا ہے، ہمایوں کو دراصل ہندوستان میں جم کر حکومت کرنے کا موقع

نہیں ملا، تاہم انھوں ڈاکٹر ایس کے بنرجی کے حوالے سے ہمایوں کے سلوک کی تصویر کشی کی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے مذہب کا احترام کرنے کے ساتھ ساتھ شیعوں کا بھی احترام کرتا تھا، ہندوؤں کی طرف بھی اس کا میلان رہا، اس کے باپ کی نصیحت نے اس کو اعتدال پسند بنا دیا تھا اسی لیے ہندوؤں اور راجپوتوں کی ریاستوں سے اس کے تعلقات اچھے تھے، ہمایوں کے عہد میں مسلمانوں کی علمی رواداری بھی جاری رہی اور ہندوؤں کے علوم وفنون پر مشتمل کئی کتابوں کا ترجمہ ہوا، یہاں مصنف کی یہ سطریں نقل کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے جس میں انھوں نے تاریخ کے اس تابناک پہلو کو پیش کیا ہے:

''چتوڑ پر جب گجرات کے بہادر شاہ نے حملہ کیا تو مہاراجہ سانگا کی بیوہ رانی کرناوتی (پاکرمتی) نے ہمایوں کو راکھی بھیج کر اپنا راکھی بند بھائی بنالیا جو اس زمانہ میں بنگال میں تھا، وہ بنگال کی مہم چھوڑ کر چتوڑ کی طرف روانہ ہوا، گو اس وقت وہاں پہنچا جب رانی موت سے دوچار ہو چکی تھی، مگر ہمایوں نے بہادر شاہ کو شکست دے کر یہ علاقہ رانی کرناوتی کے لڑکوں کے لیے محفوظ کر دیا، ٹاڈ نے اپنی مشہور کتاب میں اس واقعہ کو بڑے ولولہ انگیز انداز میں لکھا ہے کہ اکبر، جہانگیر اور شاہ جہاں نے ادے پور سے تعلقات راجپوتوں کی روایت کے مطابق قائم رکھا، وہ یہ بھی لکھتا ہے کہ اورنگ زیب نے اپنے زمانہ میں ادے پور کی مہارانی کو جو خطوط لکھے ان میں دو اس کے پاس ہیں، ان میں طرز تحریر وانشا کے لطیف اور پاکیزہ نمونے کے ساتھ راجپوتوں سے تعلقات کی روایت بھی برقرار ہے وہ مہارانی کو پیاری، نیک خصلت بہن، لکھ کر مخاطب کرتا ہے اور اس کی خیریت کا خواہاں ہوا ہے (ٹاڈ ج ۱ ص ۲۴۳-۲۴۲) ہمایوں نے مہارانی کرناوتی کے ساتھ جو سلوک کیا وہ اب افسانوں اور ڈراموں کا موضوع بنایا ہوا ہے گو موجودہ دور کے بعض مؤرخین اس واقعہ کو کچھ اور رنگ دے کر اس کی جذباتیت کو ختم کرنا چاہتے ہیں'' (ص ۱۲)

شیر شاہ کے تذکرے میں مصنف لکھتے ہیں اس کا عہد رواداری کے فروغ وچلن کا بہتر عہد رہا، اس کی فوج میں پیدل سپاہی اور بندوقچی سب ہندو تھے، گولیار کا راجہ رام ساہ شیر شاہ کی حمایت میں لڑتا رہا، اس کی فوج میں راجپوتوں کا ایک دستہ تھا، ڈاکٹر کالکارنجن کے مطابق اس کی فوج میں ہندوؤں کو باعزت عہدے ملتے رہے ڈاکٹر کالکارنجن یہ بھی لکھتے ہیں:

''شیر شاہ نے مذہب اور سیاست میں ایسا خوشگوار امتزاج پیدا کر دیا تھا جس سے ہندوستانی قومیت کو ترقی کرنے کے لیے نہایت مناسب مل گئی، مسٹر ڈبلیو کروک کی اس رائے سے کسی کو اختلاف نہیں ہوسکتا کہ شیر شاہ پہلا حکمراں ہے جس نے عوام کی مرضی کے مطابق ایک ہندوستانی سلطنت کی بنیاد ڈالنے کی کوشش کی اور یہ کام اس نے اپنے عہد کے اس سیاسی اصول سے ہٹ کر انجام دیا کہ سیاسی اتحاد مذہبی یکسانیت کے بغیر قائم نہیں ہوسکتا، اس نے یہ محسوس کیا کہ سارے ہندوؤں سے مذہب اسلام قبول کرانا محض حماقت ہے، چنانچہ اس نے نہ ہندو مذہب کے پیروؤں پر کسی قسم کی پابندی عائد کی اور نہ ان کے ساتھ ذلت آمیز رویہ اختیار کیا، اس کی مذہبی پالیسی میں بڑا اعتدال رہا، اس نے نہ کسی مندر کو منہدم کیا اور نہ کسی بت کو توڑا، اس کی مذہبی پالیسی میں صرف

رواداری ہی نہ تھی، بلکہ غیر جانب داری بھی تھی، تبلیغ اسلام کے سلسلہ میں جو باتیں حکومت کی طرف سے کی جاتی تھیں ان سب کو اس نے رکوادیا''۔(ص ۱۵۔۱۶)

مصنف نے اے ایل سری واستوا کے حوالے سے لکھا ہے:

''شیر شاہ کا تدبر اس میں تھا کہ اس نے سیاست اور مذہب کو خلط ملط نہیں کیا تھا، اس نے یہ اندازہ کرلیا تھا کہ ہندوؤں کو نظر انداز کر کے حکومت نہیں کرسکتا تھا اس لیے اس نے اپنے ملکی اور فوجی نظام میں ہندؤں کا پورا تعاون حاصل کیا''۔(ص ۱۷)

شیر شاہ کے تذکرے کے آخر میں مصنف نے ملک محمد جائسی کی ہندی میں لکھی گئی پدماوت کو مذہبی اور علمی رواداری کا شاہکار قرار دیا، ان کے مطابق پدماوت اس کا واضح ثبوت ہے کہ مسلمانوں نے تعصب سے بالا ہوکر اس ملک کی زبان کو اختیار کیا۔

اس کے بعد **اسلام شاہ** کا مختصر ذکر ہے جس میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ اس نے باپ کے عہد کی روایات ورواداری کو زندہ رکھا، پھر **اکبر** کا تفصیلی تذکرہ ہے، مصنف نے اس کے تذکرے کی ابتدا میں لکھا ہے کہ اکبر نے جو غلط اقدامات کیے جن سے مسلمانوں کے جذبات کو ٹھیس پہنچی ان کا ذکر آگے آئے گا البتہ یہاں اس کی رواداری کی تفصیل پہلے پیش کی جائے گی، اکبر کی رواداری حد سے بڑھتی گئی اس نے راجپوتوں سے رشتہ بھی قائم کیا، خود راجہ بھگوان داس کی بہن سے شادی کی، شہزادہ سلیم کی شادی بھگوان داس کی لڑکی سے کی، راجہ بھگوان داس آخر تک اکبر کی محبت کا اسیر رہا، وہ ترقی کرتا گیا اور مناصب حاصل کرتا گیا، مصنف نے اس کے تذکرے میں اس کی طرف سے **راجپوتوں کی دلجوئی** کے واقعات لکھے ہیں، **راجپوتوں کی مثالی شجاعت** کو قلم بند کیا ہے، **راجپوتوں کی مثالی وفاداری** کا تذکرہ کرتے ہوئے راجہ مان سنگھ کا ذکر کیا ہے جس کو اکبر غایتِ محبت میں راجہ مرزا کہتا تھا، اکبر نے **راجپوتوں پر اعتماد کلی** کیا اور ''مان سنگھ کو اپنے سر آنکھوں پر بٹھا کر مسلمانوں کا سارا رعب ہندوؤں کے دلوں سے نکال دیا، **مذہبی لگاؤ** کے تحت لکھا ہے کہ مان سنگھ اور اکبر کے تعلق ومحبت میں مذہب کبھی آڑے نہ آسکا جبکہ ایک مرتبہ اکبر نے مان سنگھ کو اپنے دین الٰہی کی ترغیب بھی دلائی جس کا اس نے دوٹوک انداز میں انکار کیا، مصنف نے راجہ مان سنگھ کی **لشکریوں کے ساتھ رواداری** کا بھی ذکر کیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

''راجہ مان سنگھ کا معمول یہ تھا کہ جب کسی مہم پر فوجی سردار بن کر جاتا تو وہ اپنے مسلمان لشکریوں کے لیے لشکر میں غسل کرنے کے لیے حمام اور نماز باجماعت ادا کرنے کے لیے کپڑے گھیر کر مسجد کا بھی پورا انتظام کرتا اور ایک وقت کا کھانا بھی ان کو اپنی طرف سے کھلاتا''۔(ص ۲۷)

صاحب کتاب نے **راجہ ٹوڈرمل کے ساتھ اکبر کی شاہانہ عنایت** کا بھی تذکرہ کیا ہے اور لکھا ہے کہ وہ چار ہزاری منصب پر بھی فائز ہوا، اس کے بعد اکبر کے بہت محبوب درباری **راجہ بیربر کی موت پر غم** جس طرح اکبر کو ہوا اس کا تذکرہ کیا ہے، بیربر کا اصل نام مہیش داس تھا، بعض اور واقعات ذکر کرنے کے بعد مصنف نے ایک عنوان باندھا ہے **راجپوتوں کو عہدے دینے میں فیاضی**، اس عنوان کے تحت لکھا ہے کہ اکبر عہدے دینے میں ہندو مسلم امتیاز نہیں کرتا تھا، جو اہل ہوتا اس کو عہدہ عطا کرتا، مصنف نے یہاں پر ۱۶ ہندو منصب داروں کا اختصار کے ساتھ ذکر کیا ہے جو اعلیٰ مناصب تک پہنچے، ابتدا میں لکھا ہے کہ ہم ان

منصب داروں میں بعض کا یہاں تذکرہ کرتے ہیں، اس لیے ان سولہ کو مکمل تعداد نہ سمجھا جائے، ان منصب داروں کے تذکرے کے بعد چھوٹے منصب داروں کی ایک فہرست درج کی ہے، پھر عہد اکبری میں **سنسکرت علوم کی ترویج** اور **ہندی شاعری کی سرپرستی** پر گفتگو کی ہے، اس دور کی ہندی شاعری کا تذکرہ لکھتے ہوئے انھوں نے جو عنوان لگایا ہے **ہندی شاعری کا زریں دور** اس سے پتہ چلتا ہے کہ اکبری عہد میں ہندی شاعری کو کس قدر فروغ ہوا، وہ لکھتے ہیں:

> **''اکبری دور میں ہندی شاعری کو بڑا عروج حاصل ہوا اسی دور میں ہری داس، سور داس، پدمانداس، کمبھن داس، نند داس، چتر بھوج داس، چھیت سوامی اور گووند سوامی جیسے بھگت شعرا گزرے ہیں''۔(ص۴۰)**

صاحب کتاب نے اس موقع پر **ہندی کے مسلمان شعراء** کا بھی ذکر کیا ہے اور **فنون لطیفہ میں رواداری** کی مثالیں بھی پیش کی ہیں، اکبر کی حد سے بڑھی ہوئی رواداری کا حال سناتے ہوئے لکھا ہے:

> **''محلات کے اندر دیواروں پر جو مصوری کی جاتی اس سے بھی رواداری کا اندازہ کیا جاسکتا ہے، مریم الزمانی بیگم یعنی جہانگیر کی ماں سنہرے محل کے اندر جہاں طرح طرح کے نقش ونگار تھے وہاں مصوری کے نمونے بھی تھے جن میں اس کی دیوار پر رام اور ہنومان جی کی تصویریں بھی تھیں اکبر نے جب راماین اور مہابھارت کے ترجمے فارسی میں کرائے تو ان دونوں کو مصوّر بھی کرایا اس سے نہ صرف ہندوؤں کی دلداری یا دل جوئی ہوئی بلکہ مسلمانوں کو یہ ترغیب دلائی گئی کہ یہ کتابیں وہ بھی شوق سے پڑھیں''۔(ص۴۵)**

صفحہ ۴۵ کی آخری سطر سے اکبر کے **دین الہی** کا تذکرہ شروع ہوتا ہے، اس باب میں مصنف نے اپنی راسخ العقیدگی، اور مورخانہ شان کے ساتھ بہت واضح انداز میں مدلل محاکمہ کیا ہے، انھوں نے ابتدا میں لکھا ہے کہ اکبر کی رواداریاں ایک مؤرخ کی نظر میں قابل فخر تھیں، اس کے جیسا حکمراں کسی بھی قوم کے لیے سرمایۂ افتخار تھا مگر اس کی ذات دینِ الہی کو جاری کرنے سے مجروح ہوکر رہ گئی، مصنف کے قلم سے لکھی گئی اس پوری بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ اکبر کے ذریعہ دین الہی کا وجود علماء کے حد سے بڑھے ہوئے مسلکی اختلاف اور ایک دوسرے کی تکفیر کا نتیجہ تھا، علمائے سوء کی دنیا طلبی اور حرص وہوس نے آگ پر تیل چھڑکنے کا کام کیا تھا، انھوں نے اس سلسلہ میں اکبر کے مذہبی رجحانات اور بدعات کے سخت ناقد رہے **ملا عبدالقادر بدایونی کی تحریروں** کا خلاصہ پیش کیا ہے جنھوں نے اس مذہب کی دھجیاں بکھیر کر رکھ دیں، دین الہی کے جاری کرنے کا ایک بڑا سبب اکبر کی حد سے گزر جانے والی مذہبی رواداری بھی تھی لیکن ملا عبدالقادر کی تحریریں اکبر کی مذہبی پالیسی کے تناظر میں اس کی مذہبی رواداری کی بخیہ ادھیڑ کر رکھ دیتی ہیں، ان پر کٹر پن اور مذہبی تعصب کا الزام لگایا گیا ہے لیکن مصنف نے کمال مہارت سے ملا بدایونی کی تحریر سے ہی اس الزام کی تردید کی ہے اور ان کی حمیت دینی کی تایید کی ہے، انھوں نے اس ضمن میں ابوالفضل وفیضی کے کردار کا بھی جائزہ لیا ہے اور اکبرنامہ وآئین اکبری کے سلسلہ میں بھی گفتگو کی ہے، اس بحث میں انھوں نے مولانا ابوالکلام آزاد کا ایک جامع تبصرہ نقل کیا ہے جو یقیناً بڑا بصیرت افروز ہے، یہاں طوالت سے بچنے کے لیے اس کو نقل نہیں کیا جا سکتا، مگر اس تبصرے کی بہت اہمیت ہے اس لیے کہ مولانا آزاد بہت ہی روشن خیال، روادار وفراخ دل عالم تھے، اس اہمیت کے پیش نظر مصنف کے نقل کردہ تبصرے کا آخری پیراگراف یہاں نقل کیا جاتا ہے:

> **''اکبر نے تمام حاملین مذہب کا یہ حال دیکھا**

تو سرے سے مذہب ہی کو خیر باد کر دینا چاہا، خود ابو الفضل فیضی کو بھی ان ہی لوگوں نے اپنی ہوا پرستیوں اور ظلم وعدوان کے نمونے دکھلا کر اس طریقہ میں آنے کی دعوت دی تھی جس کی بے اعتدالیاں دیکھ دیکھ کر وہ خود متاسف ہوتے ہوں گے کہ مقصود کیا تھا اور کیا سے کیا ہو گیا، انہوں نے علماء سوء کے غرور و پندار کا بت توڑنے کے لیے ایک دوسرا بت تیار کیا جس کا نام اکبر تھا لیکن آگے چل کر خود اسی بت کی پرستش ہو گئی''۔(ص۸۱)

انھوں نے مولانا علی میاں کا یہ تبصرہ بھی نقل کیا ہے:

''دین الٰہی میں توحید کے بجائے (عبادت آفتاب کی شکل میں) شرک صریح، کواکب پرستی، ایمان بالغیب کے بجائے عقیدۂ تناسخ تھا اور یہ مذہب زنجیر آتشیں بنا کر اس وقت کے اسلام کے گلے میں ڈال دیا گیا تھا''۔(ص۸۲)

چونکہ اکبر کا ایجاد کردہ دین الٰہی اسلام پر ایک شدید حملہ تھا، لہذا اس کی حمایت میں بہت سے ہندو مورخین سامنے آئے ہیں، مصنف نے مؤرخین کے اس رویہ کا بھی فاضلانہ محاکمہ کیا ہے، بالخصوص پروفیسر مکھن لال چودھری کی کتاب ''دین الٰہی'' پر گفتگو کی ہے، اس کے پہلے ایڈیشن پر علامہ سید سلیمان ندوی کا یہ تبصرہ بھی نقل کیا ہے، اس سلسلہ کی تحریروں کا محاکمہ کرنے کے بعد انھوں نے ڈاکٹر نندلال چٹرجی کا ایک تبصرہ نقل کیا ہے جو کچھ اس طرح ہے:

''اکبر کے مذہبی رجحانات سے اس کی زندگی ہی میں غلط فہمی پیدا ہو گئی تھی ونسنٹ اسمتھ نے کہا ہے کہ اکبر کا دین الٰہی اس کی حماقتوں کی یادگار ہے لیکن ایسا سمجھنا صحیح نہیں ہے، دین الٰہی میں اس کی وہ سرگرمی نظر آتی ہے جو اس میں مختلف مذہبوں کے مقابلہ اور موازنہ کے بعد پیدا ہوئی، اکبر نے کوئی عبادت گاہ قائم نہیں کی وہ مذہب میں ایک روادارانہ نقطۂ نظر پیدا کرنا چاہتا تھا، وہ دل ودماغ کی ایسی آزادی پسند کرتا تھا جس میں تنگ نظری، تشدد اور تعصب مطلق نہ ہو، دین الٰہی کوئی مذہب نہ تھا یہ تصوف کی ایک شکل تھی جس کو اس کے معتمد دوستوں اور درباریوں نے قبول کر لیا تھا اور جب کہ مذہبی پیشواؤں کا استیلا تھا، دین الٰہی کو ایک فیاضانہ اور روادارانہ نظام تصوف سمجھنا چاہئے''۔(ص۹۲)

اس بحث کے اختتام تک پہنچتے ہوئے مصنف لکھتے ہیں:

''دین الٰہی کا جو تجزیہ معاصر اور بعد کے ارباب نظر کی تحریروں کے ذریعہ سے کیا گیا ہے اس کے بعد ہمارے ناظرین خود ایک نتیجہ پر پہنچ سکتے ہیں کہ اکبر کی یہ جدت اور بدعت کہاں تک درست اور مناسب تھی، یہ محض اس کی ایک ذہنی اور سیاسی عیاشی تھی جو ابو الفضل اور فیضی کی بگڑی ہوئی ذہانت کی بدولت بروئے کار آئی لیکن یہ مذہب اس کے ساتھ ہی مر گیا بلکہ ایک روایت تو یہ ہے کہ وہ اپنی آخری زندگی میں اس سے تائب بھی ہو گیا تھا''۔(ص۹۵)

انھوں نے اس بحث میں پروفیسر کالکارنجن کا تبصرہ بھی ملخص کیا ہے اور اس پر یہ تعلیق کی ہے کہ دین الٰہی پر ان کی رائے متوازن ہے جس سے مسلمانوں کا مذہبی طبقہ بھی اتفاق کر سکتا ہے، بلاشبہ یہ تبصرہ پڑھنے کے لائق ہے، ایک غیر مسلم کے قلم سے یہ حقیقت پسندانہ جملے پڑھتے چلیے:

''لیکن اس نے ہندوؤں کے فلسفہ اور مذہب کے ساتھ شغف کا اظہار کرنا شروع کیا جو

تدبر کے سراسر خلاف تھا اگر اس شغف کا اظہار اس نے نہ کیا ہوتا تو بلاشبہ وہ دنیا کا بہت بڑا مدبر اور معمار ہوتا لیکن اس کے عجیب و غریب خیالات نے اس کو ایک نئے مذہب کا پیغمبر بنا دیا، ساتھ ہی ساتھ وہ رعایا کا سیاسی حکمراں بھی رہا اور یہی خیالات اس کی اسکیم کی تباہی کا باعث بنے اس نے کوئی متحدہ قوم نہیں بنائی بلکہ اس کی اسکیم سے ایسے چند مکار مسلمان اور غلامانہ ذہنیت کے ہندو ضرور پیدا ہوئے جو اس کو خوش کرنے کے لیے اللہ اپ نشد لکھا کرتے تھے'' (ص۹۴)

آگے وہ مزید لکھتے ہیں:

''اکبر نے اسلام کے ساتھ ناانصافی کی اس کو خواخواہ رسوا کیا جس کے لیے تاریخ اس کو معاف نہیں کرسکتی، اس نے جو کچھ کیا ریاست کے مفاد کے لیے نہیں بلکہ ایک وہم کو پورا کرنے کے لیے کیا اس کی پالیسی کی وجہ سے ہندو اور مسلمان تخت کو اتحاد و اتفاق کا مرکز سمجھنے میں بالکل قاصر رہے'' (ص۹۴)

اس بحث کے بعد مصنف نے **ابو الفضل کی عام رواداری** پر گفتگو کرتے ہوئے ایک حقیقت پسندانہ تبصرہ کیا ہے:

''ابو الفضل پر چاہے جتنے الزامات رکھے جائیں وہ بے دین، ملحد، حب جاہ کی خاطر ضمیر فروش، آدمی کا نوکر، بیگن کا نوکر نہ سہی کیوں نہ سمجھا جائے مگر اس کا یہ کارنامہ ہے کہ اس نے اپنے دور میں ہندوستان کے اندر صلح وامن، مہر و محبت، رواداری و فراخ دلی کی فضا پیدا کرنے کی پوری کوشش کی، اسی لیے اس نے ہندوؤں کے علوم و فنون کا گہرا مطالعہ کیا اس مطالعہ کے بعد اس نے جن جذبات کے ماتحت ان کو قلم بند کیا ہے وہ پڑھنے کے لائق ہے اگر وہ اسی قسم کی علمی مہم کو برابر جاری کیے رہتا تو اس کو دین الٰہی کے تجربہ میں شریک ہونے کی ضرورت نہ پڑتی'' (ص۹۹)

اکبر کے تذکرے کے آخر میں **اکبر اور رانا پرتاپ** کے عنوان سے گفتگو کی گئی ہے، جس میں انھوں نے اس امر کی وضاحت کی ہے کہ اکبر اور رانا پرتاپ کی جنگ کو اس دور میں مذہبی منافرت کے لیے زیادہ اہمیت دی گئی ہے اگرچہ تیموری عہد کے مؤرخین نے اس کو خاص اہمیت نہیں دی ہے، اس جنگ کی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں دونوں طرف راجپوت اتنے تھے کہ دوست و دشمن کو پہنچاننا مشکل تھا، اکبری فوج کی کمان راجہ، مان سنگھ کے ہاتھ میں تھی۔

آگے مصنف نے عہد جہانگیری کا جائزہ پیش کیا ہے، اس عہد کی ابتدا **جہانگیر اور نوراللہ شوستری** سے کی ہے، انھوں نے لکھا ہے کہ ''جہانگیر کی شخصیت اور حکمرانی دونوں میں دلآویزی بھی رہی اور رنگا رنگی بھی اس میں مذہبی شدت بھی تھی اور رواداری بھی.....ص۱۱۰) جہانگیر پر الزام ہے کہ اس نے نوراللہ شوستری کو قتل کرایا مگر اس نے اپنی تزک میں اس کا ذکر نہیں کیا جبکہ سکھوں کے گرو ارجن کو قتل کرایا تو بلا جھجک اپنی تزک میں ذکر کیا، اس موقع پر مصنف نے ایک دلچسپ تبصرہ کیا ہے:

''بزرگان دین سے عقیدت کے باوجود نوراللہ شوستری کا قتل اور حضرت مجدد الف ثانیؒ کی قید اس کی زندگی اور حکومت کا مسئلہ عقدۂ لاینحل بن کر رہ گیا ہے'' (ص۱۱۱)

گرو مان سنگھ سے جہانگیر بدظن تھا مگر وہ کسی کارروائی سے قبل ہی مر گیا، مصنف نے نہایت حقیقت پسندانہ تبصر کرتے ہوئے اس ضمن میں لکھا ہے:

''وہ اپنی حکومت میں جس کسی سے کوئی خطرہ

محسوس کرتا تو وہ اس کو سخت سے سخت سزا دینے میں تامل نہ کرتا تھا پھر وہ شیعہ سنی اور ہندو مسلمان کی کوئی تفریق نہ کرتا'' (ص ۱۱۳)

اسی تبصرے کے معاً بعد **شیخ ابراھیم بابا** کا ذکر کیا گیا ہے جن کو جہانگیر نے قید کرایا تھا، پھر حضرت مجدد الف ثانی پر ایک طویل بحث ہے، مصنف نے لکھا ہے اور بجا لکھا ہے کہ گرو ارجن کے قتل سے زیادہ تکلیف دہ وہ الفاظ ہیں جو جہانگیر نے مجدد الف ثانی کے لیے استعمال کیے، مصنف نے اس موضوع پر ایک فاضلانہ بحث کی ہے، جس کا ذکر سرِ دست ضروری نہیں، البتہ بالآخر مجدد الف ثانی کو رہا کیا گیا اور پھر جہانگیر نے ان کو اپنے ساتھ رکھا۔

ان واقعات کا تذکرہ کرنے کے بعد صاحب کتاب نے **مذہبی پیشواؤں سے جہانگیر کی عقیدت** کے پختہ ثبوت پیش کیے ہیں، یہی نہیں بلکہ اس کی تزک کے حوالے سے **ہندو پنڈتوں کی صحبت** پر بھی روشنی ڈالی ہے اور لکھا ہے کہ جہانگیر نے اپنے باپ کی صلح کل کی روایت باقی رکھی، وہ پنڈتوں سے مذہبی بحث بھی کر لیتا تھا، لیکن مصنف کا دعویٰ ہے کہ:

''جہانگیر کی اس قسم کی بحث افہام تفہیم کے لیے ہوا کرتی تھی، کوئی بڑے سے بڑا متعصب مؤرخ بھی اس پر یہ الزام نہیں رکھ سکتا ہے کہ اس نے اپنے دور حکومت میں ہندو مسلمان کی تفریق کی''۔ (ص ۱۲۴)

اس کا سب سے بڑا ثبوت مصنف نے جہانگیری محل میں ایک مندر کی تعمیر سے پیش کیا جو غالباً اس نے اپنی ہندو ماں اور ہندو بیویوں کی کنیزوں اور سہیلیوں کے لیے بنوایا تھا، اسی ضمن میں مصنف نے **راجپوت سرداروں سے جہانگیر کی محبت** پر گفتگو کی ہے پھر **میواڑ میں جنگ کی نوعیت** کے آخر میں لکھتے ہیں:

''ان ہی الطاف و اکرام کی نکہت بیزیوں اور شمیم انگیزیوں کی بدولت راجپوت تیموری بادشاہوں کے گرویدہ ہو کر ہر موقع پر اپنی جاں نثاری کا ثبوت دیتے رہے ان کے دلوں میں یہ بات جم گئی تھی کی تیموری بادشاہوں کی بادشاہت قومی بادشاہت میں منتقل ہوگئی ہے، کسی موقع پر ان میں احساس کمتری پیدا نہیں ہوا، اسی لیے وہ رانا پرتاپ کے خاندان کا ساتھ دینے کے بجائے اس سے بھی بر سر پیکار رہے وہ اس خاندان کی مخالفت کو اپنی قومی غیرت وحمیت کے منافی نہیں سمجھتے رہے، موجودہ دور کے بعض مؤرخوں اور شاعروں نے اس خاندان کی جنگ کو کچھ اور رنگ میں پیش کرنے کی کوشش کی لیکن بقول ڈاکٹر رام پرشاد تر پاٹھی اکبر اور رانا پرتاپ کی جنگ کسی حال میں ہندو ازم اور اسلام کی جنگ نہیں کہی جاسکتی ہے''۔ (ص ۱۲۸۔۱۲۹)

اس کے بعد فاضل مصنف نے **جہانگیر کے دربار کے راجپوت امراء** پر گفتگو کی ہے، جن میں سرفہرست **راجہ مان سنگھ** کا ذکر ہے، اسی تذکرے میں جہانگیر کی عام رواداری کے لیے تزک جہانگیری کا یہ اقتباس نقل کیا گیا ہے:

''میرے والد کے ملازمین کے اخلاص کی حقیقت کا ابھی بظاہر کوئی اندازہ نہیں ہوا تھا لیکن ان میں سے بعض اپنے تصور، غلط بینی اور ناشائستہ ارادہ پر شرمندہ تھے کیوں کہ ان کا پورا ہونا اللہ تعالیٰ اور اس کی مخلوق کو پسند نہ تھا، اس لیے میں نے بھی اپنی تخت نشینی کے دن ان سب کو معاف کر کے یہ فیصلہ کیا کہ ان سے گزشتہ امور کی باز پرس نہیں کی جائے گی پھر میرے دل میں ان سے جو خدشات تھے ان کے سلسلہ میں امیر الامرا پر پورا بھروسہ تھا، میں ان کو اپنا محافظ اور نگہبان سمجھتا تھا حالانکہ تمام بندوں کا نگہبان اللہ تعالیٰ ہے اور خصوصا بادشاہوں کا جن کا وجود دنیا کے فلاح و بہبود کے لیے ہے''۔ (ص ۱۳۰)

اس ضمن میں فاضل مورخ نے دربار جہانگیری کے ۳۵ راجپوت امراء اور ان کی خدمات، وفاداریوں اور ان کے مناصب کا مختصر و جامع تعارف لکھا ہے، بعد ازاں جہانگیر کی مذہبی رواداری کے ثبوت کے لیے **سنیاسیوں سے جہانگیر کی عقیدت** کا عنوان قائم کیا ہے، جس کے تحت سنیاسیوں سے اس کی پر کیف ملاقاتوں کا تذکرہ کیا ہے، تزک جہانگیری سے اس کے ثبوت پیش کیے ہیں، اجین کے ایک سنیاسی سے ملنے کا اس کو اشتیاق ہوا تو اس کی رہائش تک سواری نہ جا سکنے کی وجہ سے تین میل پیدل چل کر گیا، چھ گھڑی اس کی صحبت میں رہا پھر اپنی تزک میں لکھا:

''وہ علم سے خالی نہیں ہے، علم بیدانیت جو کہ علم تصوف ہے وہ خوب سمجھے ہوئے ہے، چھ گھڑی تک اس کی صحبت میں رہا بڑی اچھی باتیں ہوئیں جس سے میرے اوپر بہت اثر پڑا''۔(ص ۱۴۱)

متھرا کے ایک سنیاسی سے الوداعی ملاقات کے بعد لکھا:

''گسائیں کی ملاقات کے لیے پھر گیا اس سے وداع ہوا تو اس کی جدائی طبیعت پر بہت گراں گزری''(ص ۱۴۳)

مصنف نے راجپوت بیویوں سے جہانگیر کی قلبی محبت پر گفتگو کی ہے اور یہ بھی وضاحت کی ہے کہ راجپوتوں سے جہانگیر کی شادیاں محض ہوا و ہوس کی خاطر نہیں ہوئیں، اس کی پہلی راجپوت بیوی راجہ بھگوان داس کی لڑکی مان بائی اور اس کی موت کے واقعہ کو بیان کرنے کے بعد جہانگیر کے رنج اور اس کے قلبی لگاؤ کا ذکر کیا ہے، تزک جہانگیری کے جو اقتباسات نقل کیے ہیں انہیں پڑھ کر جہانگیر کی اس سے محبت اور اس کی موت کے غم کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے، پھر اس واقعہ پر مولانا شبلی کی یہ تعلیق نقل کی ہے:

''بے شبہ تیموریوں نے ہندوؤں کے ملک کو نہیں بلکہ اقلیم دل کو فتح کر لیا تھا اور ہندوؤں کے اخلاص و محبت نے فاتح کو مفتوح بنا لیا تھا'' ۔(۱۴۵)

اس کے بعد فاضل مصنف نے ہندو علم و ادب سے جہانگیر کی دلچسپی اور جہانگیری دور میں ہندوؤں کے علوم سے مسلمانوں کی دلچسپی پر مدلل گفتگو کی ہے، آخر میں مسلمان اور ہندو مورخین کے اقتباسات کی روشنی میں جہانگیر کی مذہبی فراخ دلی کے اعتراف کو بہت اختصار و خوبصورتی سے قلمبند کیا ہے، اس ضمن میں انھوں نے ڈاکٹر بینی پرشاد کی انگریزی کتاب ہسٹری آف جہانگیر کو بہت سراہا ہے اور اس کے حوالے سے تقریباً تین صفحات لکھے ہیں جو واقعی بہت مدلل، منصفانہ اور چشم کشا تجزیہ پر مشتمل ہیں۔

کتاب کے صفحہ ۱۵۲ سے شاہ جہاں کا تذکرہ شروع ہوتا ہے، شاہجہاں کے متعلق مصنف نے لکھا ہے کہ اگر چہ وہ راجپوت شہزادی جگت گسائیں معروف بہ بلقیس زمانی کے بطن سے تھا مگر اس پر راجپوتانہ تہذیب و تمدن کے اثرات بالکل نہ تھے بلکہ وہ جہانگیر سے زیادہ راسخ العقیدہ مسلمان تھا، اس کی زندگی کے کسی پہلو پر راجپوتوں کا اثر نہیں پایا جاتا، اس نے بڑی عالیشان مسجدیں تعمیر کرائیں، اس نے جو بھی عمارتیں بنوائیں ان پر قرآنی آیتیں کندہ کرائیں، اس کے حرم میں ایک وقت میں چار سے زائد بیویاں نہیں رہیں، وہ صوم و صلوۃ کا پابند تھا نماز با جماعت پڑھنے کی کوشش کرتا تھا۔

مصنف کے مطابق شاہجہاں اپنی تمام تر مذہب پسندی کے باوجود ہندوؤں اور بالخصوص راجپوتوں کے لیے نرم گوشہ رکھتا تھا، اس کی نرمی راجپوتوں سے ننہالی رشتہ داری کے سبب فطری تھی، مصنف لکھتے ہیں:

''وہ جب تخت پر بیٹھا تو اس کو اپنے راجپوت سرداروں پر اتنا بھروسہ رہا کہ اس کی جان کے

محافظوں کا سردار راجہ مہیش داس راٹھور اس کے تخت کے پیچھے برابر کھڑا رہتا سفر میں بھی وہ برابر اس کے ساتھ ہوتا۔ وہ بڑی فیاضی سے راجپوت اور ہندو سرداروں کو عہدے دے کر نوازتا رہا اس کے عہدیداروں میں ہندو معزز ترین منصب داروں میں تھے اس نے ہندوؤں کو اپنی سلطنت کا وکیل یعنی وزیر اعظم اور دیوان تن یعنی نائب وزیر اعظم بنانے میں بھی تامل نہیں کیا جیسا کہ حسب ذیل فہرست سے اندازہ ہوگا''۔(۱۵۳)

اس کے بعد مصنف نے پچاس سے زائد ہندو منصب داروں اور ان کے مناصب وخدمات کا تعارف کرایا ہے جن میں ویزر اعظم بھی ہیں اور امراء وسپہ سالار بھی، ان میں بعض ایسے بھی ہیں جو بعد میں اورنگ زیب کے دربار میں بھی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھے گئے، ان لوگوں کے انفرادی تعارف کے بعد **ہفت صدی کے منصب داروں**، **شش صدی کے منصب داروں** اور **پانصدی کے منصب داروں** کی اجمالی فہرست درج کی ہے جو سینکڑوں ہندوؤں پر مشتمل ہے، **شاہجہاں کی رواداری کی حکمت عملی** پر گفتگو کرتے ہوئے مصنف نے لکھا ہے کہ اس کی ''مذہبی رواداری کا ثبوت اس سے بھی ملتا ہے کہ اس نے اپنے راجپوت اور ہندو فوجی سرداروں پر وہی اعتماد کلی رکھا جو اس کو اپنے مسلمان فوجی منصب داروں پر تھا.....ص۱۶۴'' پھر اس کے ثبوت میں متعدد مثالیں پیش کی گئی ہیں۔

بعد ازاں مصنف نے **شاہجہاں پر الزامات** کا جائزہ لیا ہے، اس پر مندروں کے انہدام کے الزام کا معروضی مطالعہ پیش کیا ہے اور واضح کیا ہے کہ مندروں کے انہدام کا سبب بغاوتیں بنتی تھیں، یہی وجہ تھی کہ ان مندروں کے انہدام سے شاہجہاں کے خلاف ہندوؤں میں کوئی نفرت نہ پھیلی بلکہ وہ سب اس کے وفادار اور منصب دار رہے، مصنف نے یہاں بعض سنسکرت شعراء کے بادشاہ کی شان میں کہے گئے مدحیہ قصائد کا خلاصہ بطور ثبوت پیش کیا ہے، مصنف نے کے یم پینکر کے حوالے سے جو کچھ لکھا ہے اس کو یہاں نقل کیا جاتا ہے:

''شاہ جہاں ایک پرجوش مسلمان تھا اس پر یہ دھبہ ہے کہ اس نے کچھ مندروں، خصوصا بیر سنگھ بندیلہ کے مندر کو منہدم کیا لیکن اس نے کبھی ہندوؤں کو اپنے سے دور نہیں کیا، راجپوتوں کے ساتھ تو سیاسی اتحاد میں پختگی دکھائی، اس کے زمانہ میں شاہی ملازمت میں ہندو افسروں کی تعداد اکبر کے عہد سے زیادہ تھی، راجہ رگھناتھ اس کے مال کا نائب وزیر تھا وہ کھتری تھا مگر ترقی کرتا چلا گیا، شاہ جہاں نے اپنے لڑکے اورنگ زیب کو دکن خط لکھا کہ وہ ہندوؤں کے ساتھ مخالفانہ رویہ اختیار نہ کرے، شاہ جہاں نے اپنی ریاست کے قومی کردار کو پورے طور پر برقرار رکھا اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ جب اورنگ زیب نے باغیانہ روش اختیار کی تو شاہی فوج جودھ پور کے جسونت سنگھ راٹھور کی نگرانی میں بھیجی گئی''۔(ص۱۶۶)

آگے مصنف نے شاہجہاں کے ذریعہ **سنسکرت اور ہندی کی سرپرستی** اور **ہندی راگنیوں سے دلچسپی** پر مدلل گفتگو کی ہے جو اس کی رواداری کا منہ بولتا ثبوت ہے، **پھر ہندوؤں کے علوم سے مسلمانوں کی دلچسپی** پر گفتگو کی ہے، اسی ضمن میں **ہندوؤں کے مذہبی علوم سے داراشکوہ کی دلچسپی** کا تذکرہ کیا ہے، داراشکوہ کی ولی عہدی کو شاہجہاں کی مذہبی رواداری قرار دیا ہے، یہ بھی لکھا ہے کہ اکبر ان پڑھ تھا اس نے جو نیا مذہب ایجاد کیا وہ چل نہ سکا، مگر دارشکوہ کا مذہبی مطالعہ بہت وسیع تھا، اس نے اپنی شہزادگی کے زمانے سے ہی اپنی فکر کا اظہار شروع کر دیا

تھا کہ وہ اگر تخت نشین ہوا تو ایک نیا مذہب جنم دے گا، مصنف نے پھر اس ضمن میں اس کی تصنیفات اور اس کی فکر کو بیان کیا ہے، پھر ہندو مذہب اور سنسکرت کی ان کتابوں کا تذکرہ کیا ہے جن کے ترجمے داراشکوہ نے کرائے، آگے چل کر مصنف نے بڑا حقیقت پسندانہ تبصرہ کیا یہ:

''داراشکوہ کی ان تحریروں میں بڑی مذہبی رواداری ہے مگر راسخ مسلمان اس سے بدظن ہو گئے اور ان کو خیال پیدا ہوا کہ وہ پہلے کی طرح حنفی المسلک اور سلسلہ قادریہ کا پیرو ہونے کے بجائے ہندو ہونے کی کوشش کر رہا ہے یا کم از کم وہ اپنے عقائد کو ایسے سانچے میں ڈھال رہا ہے کہ ہندو اس کی طرف مائل ہو کر تخت و تاج کے حصول میں اس کے معاون اور مددگار ہوں''۔(ص ۱۷۶)

ادھر ہندوؤں نے اس کو اپنا ہیرو بنالیا تھا، شہزادوں کے درمیان تخت وتاج کی جنگ میں راجپوت کھل کر داراشکوہ کے ساتھ تھے لیکن بالآخر اورنگ زیب کی بصیرت اور جنگی مہارت و ہوشمندی کے بالمقابل داراشکوہ کو شکست ہوئی، مصنف نے یہاں بڑا جامع اور مبسوط اور بصیرت افروز تبصرہ کیا ہے مگر ہم صرف اس کی ابتدائی سطریں نقل کرنے پر اکتفا کرتے ہیں:

''ان لڑائیوں کے بعد دارا شکوہ کا وہی انجام ہوا جو ایک مغلوب حریف سلطنت کا ہوا کرتا ہے مگر وہ اکبر کے ساتھ اپنا یہ پیغام مؤرخوں کے لیے چھوڑ گیا کہ یہ کوشش محض شورش بے دعا ہے کہ ہندومت اور اسلام کو ملا کر ایک ایسا مذہب قائم کیا جائے جو سب کو متحد کر کے سب کو خوش رکھے، تاریخ کا فیصلہ ہے کہ ایسے ملے جلے مذہب سے چند لوگوں کے سوا عام لوگ خوش نہیں رہ سکتے اور نہ یہ قابل قبول ہوتا ہے، داراشکوہ اگر اپنے باپ اور دادا کی طرح اپنی محبت، اخلاص اور فراخ دلی سے ہندوؤں کے دلوں کی تسخیر کرتا رہتا تو ممکن ہے کہ اورنگ زیب سے بازی لے جاتا لیکن جو غلطی اکبر نے کی تھی اس نے بھی کی''۔(ص ۱۷۷)

اس کے بعد مصنف نے **شاہجہاں کے دور حکومت کی نوعیت** پر روشنی ڈالی ہے، انہوں نے لکھا ہے کہ اس کی حکومت قومی بادشاہت کی نوعیت کی تھی، اس سلسلہ میں انھوں نے ڈاکٹر بنارسی پرشاد سکسینہ کی شہادت نقل کی ہے اور یہ واضح کیا ہے کہ ایسی شاندار حکومت بغیر تسخیر قلوب کے اور ہندوؤں کو فروتر سمجھ کر قائم نہیں جاسکتی تھی، انھوں نے ڈاکٹر سکسینہ کی ہسٹری آف شاہجہاں آف دہلی کے حوالے سے طویل گفتگو کی ہے، اس ضمن میں **شاہ جہانی دربار** کا حال لکھا ہے کہ وہ شان وشوکت میں منتہائے کمال کو پہنچا ہوا تھا، اس کے زمانے میں ہندوستان میں دولت کی فراوانی تھی، سیاح یہاں کی شہرت سن کر آتے اور شاہانہ تزک و احتشام دیکھ کر دنگ رہ جاتے، **شہنشاہ کی ذات** کا جو نقشہ کھینچا گیا وہ بڑا دلچسپ و جامع ہے، اس وصف نگاری سے شاہجہاں کی جو تصویر بنتی ہے وہ ایک نرم مزاج، متدین، عبادت گذار اور باذوق و عادل بادشاہ کی تصویر بنتی ہے، **دیوان عام** اور **دیوان خاص** کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں، **شاہ برج**، **شام کے مشاغل** اور **خواب گاہ** کے حالات بیان کیے گئے ہیں، یہ بھی لکھا گیا ہے کہ وہ خواب گاہ میں پردہ کی اوٹ سے کتابیں پڑھوا کر سنتا تھا، اکثر اوقات یہ کتابیں بزرگان دین کی سوانح عمریوں پر مشتمل ہوتی تھیں، باقاعدہ **انصاف کا دربار** لگا کرتا تھا، **ترتیب ونظم** کا اس کے عہد میں خاص خیال رکھا جاتا تھا، اس کے دربار میں علماء وفضلاء آداب وتسلیم بجالانے سے مستثنی تھے وہ صرف السلام علیکم کہنے پر اکتفا کرتے تھے، دیوان عام اور دیوان خاص میں **جشن** کے

متعلق معلومات فراہم کی گئی ہیں، **دربار کے عجائبات** کا تذکرہ کیا گیا ہے، **کلچر کی ترقی** پر خاص طور سے گفتگو کی گئی ہے، **تعلیم** کے ضمن میں اس دور کے تعلیمی نظام اور حکومت کی سرپرستی کا تذکرہ کیا گیا ہے، اس کے عہد میں علمی سرگرمیاں قائم رہیں، فارسی سرکاری اور درباری زبان تھی، اس لیے اس کی خاص سرپرستی ہوتی رہی، اسی لیے ایرانی شعراء خاص طور پر ہندوستان آئے، اس دور میں شعراء نے خاص طور پر فروغ پایا، جب کہ اس عہد میں نثر نے بھی اچھی خاصی ترقی حاصل کی، اس کے زمانے میں چار لغت تیار کیے گئے جو شاہجہاں کے نام معنون ہوئے، بہت سے ترجمے ہوئے، **مذہبی کتابیں** بھی لکھی گئیں، **طب** کو خاص ترقی حاصل ہوئی، متعدد قابل قدر اطباء پیدا ہوئے، **نجوم وریاضی** اور **دیگر علوم** کا بھی غلغلہ بلند ہوا، **ہندی** کی ترقی میں اس کا عہد ممتاز اور شاندار قرار دیا گیا، **عمارتیں** اس دور میں خوب تعمیر ہوئیں، یہ کہا جا سکتا ہے کہ علم وادب سے زیادہ اس کے عہد میں فن تعمیر کو ترقی ملی، **مصوری**، **خطاطی** اور **موسیقی** کو بھی فروغ حاصل ہوا، شاہجہاں کے طرز حکومت پر گفتگو کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس کی پوری سلطنت کی اساس ایک مکمل نظام پر تھی، اس کے طرز حکومت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے:

''اس کے پورے نظام حکومت میں ایک قوت اور زندگی محسوس ہوتی تھی، بلخ، قندھار اور دکن میں بڑی لڑائیاں لڑی گئیں لیکن سلطنت کے دوسرے حصوں میں امن اور استحکام بھی قائم رہا، منوکی نے شاہ جہاں کے عدل وانصاف کے بہت سے واقعات لکھے ہیں، ٹیوریز کا بیان ہے کہ شاہراہوں پر ایسا امن قائم تھا کہ کبھی کسی کو چوری کی سزا نہیں دی گئی''۔(ص ۱۹۵)

آخر میں مصنف نے ڈاکٹر بنارسی پرشاد کو سراہتے ہوئے اپنے اس قلق کا اظہار کیا ہے کہ اگر موجودہ عہد کے ہندو مورخین اسی روش پر چلتے تو شاید آج کی فضا اس قدر مسموم نہ ہوتی انھوں نے آخر میں پروفیسر پی سرن کی کتاب ''مغلوں کی صوبائی حکومت'' کا ایک اقتباس بھی اسی ضمن میں نقل کیا ہے، جس سے مغلوں کی رواداری اور انصاف پسندی اور ان کے نظم ونسق کا حال معلوم ہوتا ہے، یہاں آخر میں ہم مصنف کا یہ آخری پیراگراف نقل کرتے ہیں جس سے ان کے فکر وخیال پر روشنی پڑتی ہے اور ان کی تصنیف کا لب لباب بھی سامنے آتا ہے اور جس سے بعض مؤرخین نے جو غیر منصفانہ رویہ اپنایا اس پر حسرت کا اظہار بھی ہوتا ہے، وہ ڈاکٹر بنارسی پرشاد کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ڈاکٹر بنارسی پرشاد نے جس مؤرخانہ رواداری کے ساتھ شاہ جہاں کی حکومت پر عام تبصرہ کیا ہے وہی رواداری دوسرے ہندو مؤرخین اور مغل بادشاہوں کی حکومتوں پر تبصرہ کرتے وقت اختیار کرتے تو آج ملک میں ہندو مسلمان کا ذہن تمام زہریلے اثرات سے پاک ہوتا، ڈاکٹر بنارسی پرشاد کی طرح بنارس کی ہندو یونیورسٹی کے سابق پروفیسر پی۔سرن نے اپنی کتاب ''مغلوں کی صوبائی حکومت'' لکھ کر اسی قسم کی رواداری کا ثبوت دیا ہے ان کی کتاب کا ایک باب قانون، عدل، پولس اور جیل ہے، اس میں مغل بادشاہوں کی عدل پسندی کو بڑا سراہا ہے، ظاہر ہے کہ یہ عدل پروری اسی وقت ممکن ہے جب حکمرانی میں مذہبی، سیاسی، معاشرتی اور طبقاتی رواداری ذہن پر چھائی ہو، اپنی عدل نوازی میں مغل بادشاہوں نے اسی رواداری کا ثبوت دیا''۔(ص ۱۹۵۔۱۹۶)

☆☆☆

❑ ادبیات

حاجی امداد اللہ مہاجرِ مکّی اور اُن کا شعری سرمایہ

ندیم احمد انصاری
(ڈائریکٹر الفلاح اسلامک فاؤنڈیشن، انڈیا)

قادرالکلام شاعر، عظیم صوفی بزرگ، مجاہدِ تحریکِ آزادی، اکابر علماے ربانیین کے پیر و مرشد، حاجی امداد اللہ مہاجرِ مکی رحمہ اللہ کی ذات اہلِ علم و دانش، خصوصاً دینی حلقوں میں کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ آپ کی دس تصنیفات یکجا 'کلیاتِ امدادیہ' کے نام سے بار بار شایع ہوتی رہی ہیں، جن میں 'ضیاء القلوب'، 'فیصلہ ہفت مسئلہ'، 'ارشادِ مرشد'، 'منشور اور 'مثنوی تحفۃ العشاق'، 'غذاے روح'، 'گلزارِ معرفت'، 'جہادِ اکبر'، 'نالۂ امدادِ غریب' اور 'دردِ غم ناک' منظوم ہیں۔ حاجی صاحب نے ایک طرف جہاں علم و عرفان اور رشد و ہدایت کا جہان آباد کیا، وہیں اپنی صوفیانہ شاعری سے مئے محبت کے جام بھی لٹائے۔ انھیں مکتبِ دیوبند میں شعر و ادب کے باب میں وہی مقام حاصل ہے جو انسانوں میں حضرت آدمؑ اور اردو زبان و ادب میں ولی دکنی کو۔ پروفیسر انوار الحسن انور شیرکوٹی کے بقول 'حاجی امداد اللہ صاحب شعرا و علماے دارالعلوم دیوبند کے ولی یا باوا آدم تھے۔ ان کو اردو اور فارسی دونوں زبانوں کی شاعری سے شوق و دلچسپی اور ذوق تھا''۔

نام و نسب اور تاریخِ ولادت:

حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کی ولادت بروز شنبہ، 22 صفر کو 1233ھ، مطابق 1817ء میں قصبہ نانوتہ ضلع سہارنپور میں ہوئی۔ آپ کا نام نامی آپ کے والد مرحوم 'حافظ محمد امین' نے 'امداد حسین' رکھا تھا، لیکن حضرت شاہ محمد اسحاق صاحب نبیرۂ شاہ عبدالعزیز صاحب نے آپ کو 'امداد اللہ' لقب سے نوازا۔ آپ کا تاریخی نام 'ظفر احمد' ہے۔ حاجی صاحب کا سلسلۂ نسب حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے۔

تعلیم و تربیت اور فیضِ عام:

حاجی صاحب کی عمر ابھی فقط سات سال تھی کہ والدہ محترمہ انتقال کر گئیں اور بہ وجہِ شفقت یہ وصیت کی کہ میرے بعد اس بچّے کو کوئی ہاتھ نہ لگائے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آپ کی تعلیم وغیرہ کا کوئی خاص اہتمام نہ کیا جا سکا، البتہ آپ نے 1258ھ میں خود اپنے شوق سے قرآن مجید چند دنوں میں حفظ کر لیا۔ سولہ سال کی عمر میں مولانا مملوک علی صاحب کے ہم راہ دہلی کا سفر کیا اور فارسی کی مختصر کتابوں کے ساتھ ساتھ صرف و نحو پر عبور حاصل کیا۔ اسی دوران مولانا رحمت علی تھانوی سے ''تکمیل الایمان'' اور شیخ عبدالحق دہلوی کی قرات اخذ فرمائی۔ ابھی تک علومِ ظاہری سے فراغت نہ ہوئی تھی کہ آپ کے دل میں خدا طلبی کا ولولہ موجزن ہوا اور آپ فقط اٹھارہ سال کی عمر میں مولانا نصیر الدین صاحب نقشبندی مجددی دہلوی کے ہاتھ پر بیعت ہو گئے۔ ان کے انتقال کے بعد مولانا میاں جی نور محمد جھنجھانوی سے بیعت کی اور ہر دو سے خرقۂ خلافت سے سرفراز ہوئے۔ اس طرح آپ کی ظاہری تعلیم گو کہ زیادہ نہ ہوئی لیکن آپ کے باطنی اور لدنّی علوم کے سبب بڑے بڑے علما و صلحا آپ کے مرید و خلیفہ ہوئے۔ حاجی صاحب کے سلسلے میں ہندوستان، پاکستان، بنگلہ دیش ہی نہیں، حجاز، شام، عراق، ترکی، مصر اور مراقش کے علما اور درویش بھی وابستہ تھے۔ ہندوستان میں

مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا محمد یعقوب نانوتوی، مولانا ذوالفقار دیوبندی، مولانا محمود حسن دیوبندی، مولانا خلیل احمد سہارنپوری اور مولانا اشرف علی تھانوی جیسے کبار علما آپ ہی کے ارادت مند ہیں۔ ایک بار کسی نے مولانا تھانوی سے پوچھا کہ حضرت حاجی صاحب کے پاس ایسا کیا ہے جو علما کے پاس نہیں کہ وہاں جاتے ہیں۔ مولانا موصوف نے جواب دیا۔ ''ہمارے پاس الفاظ ہیں اور وہاں معانی ہیں''۔ صاحبِ ''گلِ رعنا'' مولانا عبدالحیی نے اپنی مشہور عربی تصنیف ''نزہۃ الخواطر'' میں بھی حاجی صاحب کی خدمات کا اعتراف نہایت احترام کے ساتھ کیا ہے۔

شعری سرمایہ:

حاجی صاحب نے متعدد شعری اصناف میں طبع آزمائی کی ہے۔ حمد، مناجات، نعت، منقبت، قصیدہ، مرثیہ، غزل، مثنوی، مثلث، رباعی اور مخمس تمام اصناف میں آپ کا کلام موجود ہے۔ بقول مرتبِ 'گلزار معرفت': 'حضرت پیر و مرشد کا کلام منظوم اس کثرت سے ہے کہ اس کا احصا اور ضبط دشوار ہے، اس لیے آپ کے اشعار کی کوئی حتمی تعداد بیان کرنا ہماشما کے بس سے باہر ہے..... تاہم محققین نے اس سلسلے میں جو تحقیق پیش کی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے اردو اشعار کی کل تعداد 5995، فارسی اشعار 93 اور مجموعی تعداد 6088 ہے'۔ [ماہنامہ دارالعلوم]

حاجی صاحب اپنی شعر گوئی کے متعلق فرماتے ہیں

ہے نہ یہ شعر و غزل ہے اپنی مجذوبانہ بڑ
بڑ نہیں یہ مشق کو کرتے ہیں کچھ ارشاد ہم
ڈر ہے کیا فوجِ گنہ سے، ہے خدا بخش اپنا نام
اور تجھ پر رکھتے ہیں اللہ کی امداد ہم

'گلزار معرفت' کی ایک غزل میں فرماتے ہیں ؎

ہم نہ شاعر ہیں، نہ ملا ہیں، نہ عالم ہیں ولے
رکھتے ہیں ہر باب میں اللہ سے امداد ہم
اے خدا بخش اس زمین میں لکھ غزل اک اور تو
تا کہ جانیں شعر گوئی میں تجھے استاذ ہم

(۱) حاشیہ مثنوی مولانا روم

حاجی صاحب کو مولانا رومؔ کے کلامِ معرفت سے والہانہ لگاؤ تھا۔ آپ نے مثنوی منشی عبدالرزاق صاحب جھنجھانوی سے سبقاً پڑھی تھی، اور منشی صاحب مثنوی کے دفترِ ہفتم کے مصنف یعنی خاتمِ مثنوی حضرت مفتی الٰہی بخش صاحب نشاطؔ کاندھلوی کے صاحب زادے مولانا ابوالحسن کاندھلوی کے شاگرد تھے۔ حاجی صاحب نے فارسی زبان میں اس پر حاشیہ لکھا، جو اپنے آپ میں ایک بڑا کارنامہ ہے۔ آپ کی حیات میں اس کے صرف دو حصے طبع ہو سکے۔ بعد میں مولانا اشرف علی تھانوی نے اس میں مزید تشریحات کا اضافہ کر کے مکمل مثنوی کو تقریباً تیس جلدوں میں بنام 'کلیدِ مثنوی' شایع کیا۔

(۲) غذائے روح

تعلیم و تلقین کے لیے اس مثنوی میں قصص و حکایات سے مدد لی گئی ہے۔ اول حمد و نعت اور خلفاے راشدین کی منقبت ہے، پھر اپنے پیر و مرشد حافظ نور محمد جھنجھانوی کا ذکرِ خیر کیا ہے۔ بعدہ عنوان کی مناسبت سے غذاے روح کو موضوعِ سخن بنا کر سیر حاصل بحث کی ہے۔ یہ تصنیف 85 صفحات کو محیط ہے، جس میں تقریباً 1600 اشعار ہیں۔ سنِ تحریر اور نامِ تصنیف کو شعر میں اس طرح نظم کیا ہے

سالِ ہجری بھی ہوا جب ختم یار
یک ہزار دو صد و شصت و چہار
جب ہوئی یہ مثنوی یارو تمام
رکھ دیا اس کا غذاے روح نام

(۳) تحفۃ العشاق

یہ مثنوی عشقِ حقیقی اور معرفت سے لبریز ہے۔ اس میں عاشقانِ الٰہی کے لیے ایسے عمدہ مضامین بیان کیے گئے ہیں

جن سے خدا کی معرفت کے حصول کا طریق معلوم ہو۔ یہ کتاب 65 صفحات کو محیط ہے، جس میں شامل اشعار کی تعداد تقریباً 1324 ہے۔ تاریخِ تصنیف اس طرح موزوں کی ہے ؎

بارہ سو تھے اور اکاسی سالِ ہجر
ہو چکا جب حضرت تحفہ کا ذکر
ہو چکی جب مثنوی تحفہ تمام
تحفۃ العشاق رکھا اس کا نام

(۴) گلزارِ معرفت

یہ حاجی صاحب کے اردو و فارسی کلام کا مجموعہ ہے، جس کے جامع و مرتب آپ کے ایک مرید 'میاں نیاز احمد' ہیں۔ 33 صفحات کو محیط اس کتاب میں 319 اشعار زبانِ اردو اور 93 اشعار زبانِ فارسی میں ہیں۔ اس میں حمد، نعت کے علاوہ بعض غزلیات اور مدینہ منورہ میں قیام پذیری کے شوق و جذبات پر مبنی اشعار شامل کیے گئے ہیں۔ نمونہ ملاحظہ ہو ؎

ہے بڑا اچھا جو سمجھے آپ کو
اور بالا سب پہ کھینچے آپ کو
مردمِ دیدہ سے سیکھ امداد تو
سب کو دیکھے اور نہ دیکھے آپ کو

(۵) جہادِ اکبر مع نالۂ امدادِ غریب

'جہادِ اکبر' کسی غیر معلوم شخص کی فارسی تصنیف کا منظوم ترجمہ ہے، جس میں اصلاحِ نفس کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اس کا نام 'جہادِ اکبر' اس لیے تجویز کیا گیا کہ حدیث کے مطابق سرحد پر جنگ کے مقابلے میں نفس سے جہاد کرنا اکبر ہے۔ اس کا سنِ تصنیف 1266ھ ہے۔ اس میں کل 36 صفحات اور 679 اشعار ہیں۔ مزید 12 صفحات کو محیط ایک منظوم رسالہ بنام 'نالۂ امدادِ غریب' اس کے ساتھ منسلک ہے، جس میں ایک رباعی کے بعد، ایک مثنوی، ایک غزل اور پانچ مناجاتیں ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

بیاں اب یہ حال اپنا کرتا ہوں میں
کہ جس فکر میں روز مرتا ہوں میں
مجھے آ گیا جو خیال ایک رات
لگا سوچنے اپنے دل میں یہ بات
کہ افسوس غفلت میں جاتی ہے عمر
سدا کوس رحلت بجاتی ہے عمر
مجھے فکر کل کی ہوئی آج یوں
کہ کی دولتِ عمر برباد کیوں
نہ سویا شب اس فکر میں ایک دم
رہا رات بھر اس سے میں چشمِ نم
اسی میں گئی رات ساری گزر
شش و پنج کرتا رہا تا سحر
کہا نفس کو آخرش میں نے رات
کہ کیا ہو گیا تجھ کو اے بد صفات
خبر حال کی تجھ کو اپنے نہیں
کہ آیا تھا یاں کس لیے اے لعیں
بتا تجھ سے کیا حق کو منظور تھا
یہاں آکے کیا کام تو نے کیا

(۶) دردنامۂ غم ناک:

دس صفحے کی اس مثنوی میں 175 اشعار ہیں۔ اس میں بھی حسبِ عادت جذبۂ عشقِ حقیقی کا موثر بیان ہے۔ ابتدائی چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

سنو یارو عجب قصہ ہمارا
بیاں کرتا ہوں میں جو غم کا مارا
سناتا ہوں تمھیں اس کو سراسر
گزرتا ہے جو کچھ اب میری جاں پر
گزرتا ہے جو مجھ پر ان دنوں حال
نہ تھا کچھ اس سے پہلے غم کا جنجال
پڑا سوتا تھا میں خوابِ عدم میں
نہ تھا کچھ مبتلا ہستی کے غم میں

☆☆☆

❑ مطالعۂ مذاہب

سناتن دھرم اور اسلام ۔ چند غلط فہمیوں کا ازالہ

محمد عبداللہ بن شمیم ندوی
اسکالر ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی علی گڑھ

اس تحریر کے ذریعے ہندوستانی مسلمانوں اور برادران وطن کے درمیان پائی جانے والی چند ایسی غلط فہمیوں کا ازالہ مقصود ہے جن کی وجہ سے دونوں قوموں کے درمیان کی خلیج بڑھتی جارہی ہے، محبتوں کی جگہ نفرتوں نے لے لی ہے اور رواداری کی جگہ تعصب آ گیا ہے۔ جس میں سے ایک غلط فہمی یہ ہے کہ ہندوستان میں اسلام محض ۱۴۰۰ سال قبل مسلم تاجروں، صوفیوں اور مسلم افواج کے ذریعے آیا تھا۔ جب کہ یہ بات برادران وطن میں ایک اور بڑی غلط فہمی پیدا کرتی ہے، وہ یہ کہ اسلام تو ابھی صرف ۱۴۵۰ سال پرانا مذہب ہے جسے لے کر حضرت محمد ﷺ عرب میں مبعوث کئے گئے تھے۔ اسلام ایک پردیسی مذہب ہے جس کا سرزمین ہند سے دور کا بھی تعلق نہیں۔ اسلئے یہ ہندوستانی اقوام کے لئے نا قابل قبول ہے۔ جبکہ سناتن دھرم ہزاروں سال پرانا ہندوستانی مذہب ہے جو یہاں کی تہذیب وروایت کا علمبردار ہے۔ اور اسے دنیا کے قدیم ترین مذہب ہونے اور اس کی کتاب وید کو قدیم ترین مذہبی کتاب ہونے کا شرف حاصل ہے تو بھلا اسلام کا سناتن دھرم سے کیا مقابلہ؟

دوسری بڑی غلط فہمی آریہ تہذیب کے سلسلے میں ہے۔ وہ یہ کہ آرین قوم اپنے شروعاتی دور سے ہی ظالم وجابر اور نہایت رذیل قوم تھی جس نے عورتوں کے حقوق سلب کئے اور خدا کے بندوں کو چار طبقات میں تقسیم کر کے ایک طبقہ کو سارے حقوق ومراعات دیئے اور دوسرے سے حق زندگی تک چھین لیا اور یہاں تک کہ پورے ملک کو اپنا غلام بنا لیا۔ اسی طرح کی کچھ غلط فہمیاں برادران وطن کو مسلمانوں کے تعلق سے بھی ہیں۔ آج ملک جن ناگفتہ بہ حالات سے گزر رہا ہے ایسے وقت میں ان غلط فہمیوں کا ازالہ نہایت ضروری ہے، کیونکہ ان کے ازالہ سے ہندوستان کی ان دونوں اقوام کے درمیان جو خلیج ہے اسے بآسانی پاٹا جاسکتا ہے۔ اس سے نہ صرف ملک میں امن وامان قائم ہوگا بلکہ دعوت کے میدان میں بھی یہ نہایت فائدہ مند ثابت ہوگا۔

سرزمین ہند سے مسلمانوں کا رشتہ

حقیقت تو یہ ہے کہ اسلام ہی دنیا کا اولین مذہب ہے، جسے لیکر از آدمؑ تا محمد ﷺ ایک لاکھ سے زائد انبیاء ورسل آئے۔ اس لئے ہندوستان کا اصل مذہب بھی اسلام ہی تھا جو بگاڑ کے بعد اپنی اصلی شکل کھو بیٹھا۔ چنانچہ نبی پاکؐ کے جانشیں داعیان کرام اور صوفیہ حضرات وغیرہ اسلام کے اس بھولے بسرے پیغام کو یاد دلانے آئے تھے۔ اور انھوں نے اپنی اس ذمہ داری کو بخوبی انجام دیا۔ لیکن افسوس پچھلی کئی صدیوں سے مسلمانوں نے اپنی اس داعیانہ ذمہ داری سے غفلت برتی جس کی وجہ سے آج یومیہ ہزاروں برادران وطن مرنے کے بعد ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جہنم اور دردناک عذاب کا شکار ہو رہے

ہیں، کیونکہ ہم اس کلمہ کے علمبردار ہونے کے باوجود اپنے ان بھائیوں تک اس کا پیغام نہیں پہنچاتے ہیں۔ اور وہ اپنے پروردگار کو پہچانے بغیر ہی دنیا سے چلے جاتے ہیں۔

برادران وطن اور مسلمانوں کے درمیان پائی جانے والی غلط فہمیوں کا ازالہ کرنے کیلئے ضروری ہے کہ ہندوستان سے مسلمانوں کے اولین رشتہ کے بارے میں تحقیق کی جائے۔ قدیم ہندوستانی کتابوں اور تاریخ اسلامیہ کی معتبر کتب کا مطالعہ کیا جائے تو یہ جان کر حیرانی ہوگی کہ سرزمین ہند سے اسلام اور مسلمانوں کا رشتہ محض ۱۴۵۰ سال پرانا نہیں ہے بلکہ یہ رشتہ اتنا ہی قدیم ہے جتنی قدیم انسانیت ہے۔ کیونکہ مسلمانوں کے اعتقاد کے مطابق انسانیت کی ابتداء جس گوشۂ ارض سے ہوئی وہ سرزمین ہندوستان ہے۔ حضرت آدمؑ جنت سے سب سے پہلے ہندوستان میں ہی اتارے گئے کیونکہ بابا آدمؑ دنیا کے سب سے پہلے مسلمان اور اسلام کے سب سے پہلے پیغمبر تھے اس لئے ہندوستان پر سب سے پہلا قدم ایک مسلمان نے ہی رکھا اور اسلام کی ابتداء بھی ہندوستان ہی سے ہوئی اور پھر یہاں سے خدا کا پیغام ساری دنیا میں پہنچایا گیا۔ حضرت آدمؑ کے ہندوستان میں اتارے جانے سے متعلق جو روایات ملتی ہیں وہ شہرت کے درجہ کو پہونچی ہوئی ہیں اور تاریخ اسلام کی معتبر ترین کتابوں نے ان روایات کو نقل کیا ہے۔ چنانچہ ''تاریخ طبری'': ۱۱۸/۱ میں حضرت ابن عباس اور حضرت علی سے ''الکامل فی التاریخ'' ۲۲/۱ میں حضرت علی حضرت ابن عباس اور حضرت قتادہ سے اور ''البدایہ والنہایہ'' ۸۴/۱ میں حضرت حسن اور حضرت السدی سے یہی روایات نقل کی گئی ہیں۔ اسی طرح ''سبحۃ المرجان في آثار ہندوستان'' میں مولانا غلام علی آزاد بلگرامی نے اس مضمون کی کئی روایات جمع کر دی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت آدمؑ نے پہلا قدم سرزمین ہند میں ہی رکھا تھا۔

اسلامی مآخذ کے علاوہ حضرت آدمؑ اور حواؑ سے متعلق بعینہ یہی واقعات سناتن دھرم کی قدیم کتابوں میں بھی ملتے ہیں۔ جیسے حضرت آدمؑ کی تخلیق، فرشتوں کا انھیں سجدہ کرنا، حضرت آدم سے حضرت حوا کا تخلیق کیا جانا، شیطان کا دونوں کو بہکا کر شجر ممنوعہ چکھوانا اور پھر بطور سزا کے دنیا میں اتارا جانا۔ ملاحظہ کریں: رگ وید: پہلا منڈل سوتر نمبر ۱۰ تا ۱۷۔ بھوشیہ پران پرتی سرگ کا پہلا کھنڈ۔ رام چرتر مانس بال کانڈ، شلوک ۱۴۱ کی پہلی چوپائی۔

اس تحقیق سے یہ حقیقت بھی آشکارا ہوتی ہے کہ جب تمام انسان حضرت آدم اور حضرت حوا (**سویمبھو منو اور شتروپا**) کی اولاد ہیں تو دنیا کے تمام انسان چاہے وہ جس مذہب کے پیروکار ہوں ان کا آپسی رشتہ خون کا رشتہ ہے، اور ابتداء کے اعتبار سے سب کا ایک مذہب ہے اور وہ ہے ''اسلام''۔ اور یہ بھی حقیقت ہے کہ دنیا میں بسنے والی کوئی چھوٹی بڑی قوم ایسی نہیں گزری جہاں خدا کا کوئی پیغمبر خدا کی وحدانیت کا پیغام لیکر نہ آیا ہو۔ چنانچہ ارشاد خداوندی ہے "ولكل قوم هاد" (الرعد:۷) (ہر قوم کے لئے ایک ہادی اور رہنما بھیجا گیا)۔ ''ولكل أمة رسول'' (سورہ یونس:۴۷) (ہر امۃ کے لئے ایک رسول بھیجا گیا)۔ اللہ کے یہ فرستادے دنیا کے ہر گوشے میں بھیجے گئے۔ ارشاد فرمایا "و ان من أمة الا خلا فيها نذير" (سورہ الفاطر:۲۴) (کوئی بستی ایسی نہیں جہاں کوئی ڈرانے والا نہ آیا ہو)۔ اللہ تعالیٰ نے اپنا پیغام پہونچانے کے لئے لسان قوم کی حکمت سکھائی ہے۔ چنانچہ جس قوم کی طرف بھی کوئی پیغمبر بھیجا گیا تو اس قوم کی زبان میں ہی بھیجا گیا، تاکہ پیغام ہدایت کو بخوبی سمجھ سکیں۔ ارشاد خداوندی ہے: ''وما أرسلنا من قبلك الا

بلسان قومه لنبين لهم" (سورہ ابراہیم:۴) (اور ہم نے آپ سے پہلے جس کسی کو بھی بھیجا اس کی قوم کی زبان میں بھیجا تا کہ ہم ان پر (ہدایت کو) واضح کر دیں۔

پیغمبران خدا کی جماعت ہندوستان میں بھی بھیجی گئی

اس پوری تحقیق کے بعد ہم یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ حضرت آدمؑ سے محمد عربی ﷺ تک پیغمبروں کی ایک بڑی تعداد ہندوستان میں بھی بھیجی گئی، کیونکہ پیغمبروں کا یہاں آنا قانون الٰہی کے مطابق طے شدہ حقیقت ہے۔ اور اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ یہاں جو پیغمبر آئے وہ پیغام الٰہی یہاں کی زبان میں ہی لے کر آئے۔ یہ اور بات ہے کہ اقوام ہند نے بھی دنیا کی دیگر قوموں کی طرح اپنے نبیوں کی تعلیمات کو فراموش کر دیا۔

قوموں کی تاریخ کا مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ دنیا کی قدیم ترین اقوام میں ''سناتن دھرم'' کے پیروکار یعنی ہندو بھی ہیں۔ اگر سنسکرت زبان میں سناتن دھرم کا ترجمہ معلوم کریں تو یہ جان کر حیرانی ہوگی کہ سناتن دھرم دراصل اسلام ہی ہے۔ کیونکہ ''سناتن'' کے معنیٰ ہیں ''القیم'' یعنی قائم رہنے والا اور ''دھرم'' کے معنیٰ ''الدین'' کے ہیں، سناتن دھرم کا عربی ترجمہ ''الدین القیم'' ہے۔ قرآن نے اسلام کو ''الدین القیم'' کہا ہے۔ ارشاد خداوندی ہے: **" ذلك الدين القيم ولكن أكثر الناس لا يؤ منون** (سورہ الروم:۳۰) (یہ ہمیشہ باقی رہنے والا دین ہے لیکن اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے۔)

سناتن دھرم کی بنیادی کتب ''وید'' ہیں اور دوسرے درجہ کی کتب ''اپنیشد'' اور ''پران'' ہیں ان کتابوں کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مذہب میں توحید کا اقرار، شرک کی شناعت، رسالت کا تصور اور آخرت پر ایمان ہو بہو قرآنی تعلیمات کے مطابق موجود تھا لیکن مرور زمانہ سے اس میں بھی دیگر مذاہب کی طرح تحریفات کر دی گئیں اور شیطان کے کارندوں نے سناتن دھرم میں سے توحید کو مسخ کر کے شرک اور بت پرستی کو اس میں داخل کر دیا۔ تاریخ ہند کی سب سے معتبر کتاب ''کتاب الہند'' ہے جس میں علامہ البیرونی نے ہندو قوم کی تاریخ اور اس کے عقائد و رسومات کے بارے میں بڑی تفصیلی گفتگو کی ہے۔ علامہ'' البیرونی '' کی تحقیق ہے کہ ہندو قوم میں بت پرستی کی ابتداء ''راجہ انبرش'' کے زمانے کے بعد شروع ہوئی۔ وہ لکھتے ہیں: ''راجہ انبرش اپنی سلطنت تیاگ کر یاد الٰہی میں مشغول ہو گیا تھا اس وقت اسے خدا کا دیدار ایسے انسان کی شکل میں ہوا جس کے چار ہاتھ تھے، خدا نے اسے احکامات دیئے، جن کے مطابق اس نے پھر سے سلطنت شروع کی۔ راجہ کے انتقال کے بعد اس کی قوم نے چار ہاتھ والے دیوتا کا بت بنا کر پرستش شروع کر دی'' (کتاب الہند مترجمہ اردو: از سید اصغر علی۔ ص ۱۲۵) ہندوستان میں اجتماعی بت پرستی کی شروعات راجہ سوراج نے کروائی تھی۔ تاریخ فرشتہ'' کے مصنف ''محمد قاسم فرشتہ'' لکھتے ہیں: ''ہندوستان میں (اجتماعی) بت پرستی راجہ سوراج کے زمانے میں شروع ہوئی، جھارکھنڈ کے ایک برہمن نے راجہ کو اس بات کا یقین دلا دیا کہ اگر وہ اپنے بزرگوں کے سونے چاندی کے مجسمے بنوا کر ان کی پوجا کرے گا تو وہ صراط مستقیم کو پالے گا، چنانچہ راجہ نے اس کو قبول کیا اور اس کی قوم نے بھی اس کا یقین کر لیا، اور ہندوستان میں آگ کی عبادت کا تصور ایک ایرانی شخص لایا تھا''۔ (تاریخ فرشتہ از محمد بن قاسم مترجمہ عبدالحی خواجہ)

ویدوں کا اگر بغور مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس کے کلام الٰہی ہونے کا قوی امکان موجود ہے۔ کیونکہ بیشمار تحریفات کے باوجود آج بھی اس میں توحید رسالت اور آخرت سے متعلق جو تعلیمات موجود ہیں وہ ہو بہو وہی خدائی

تعلیمات ہیں جن کو قرآن نے بیان کیا ہے۔مزید برآں اس ہزاروں سال پرانی کتاب میں نبی آخرالزماں صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق ایسی واضح پیشین گوئیاں موجود ہیں جن کا کسی انسانی کلام میں ہونا محال ہے۔اور جہاں تک اس نبی کا تعلق ہے جس پر وید اتارے گئے تو اس پر اب تک کی سب سے اچھی تحقیق مطالعۂ ادیان کے ماہر علامہ سید عبداللہ طارق صاحب نے پیش کی ہے۔

انھوں نے مضبوط دلائل اور تاریخی شواہد سے ثابت کیا ہے کہ ''وید'' جس شخص پر اتارے گئے وہ کوئی اور نہیں بلکہ ہمارے سب سے پہلے رسول حضرت نوحؑ ہیں۔وید خود اس بات کی تائید کرتے ہیں۔چنانچہ وید میں حضرت نوح علیہ السلام کو ''وَیوَسوَت'' (مہا جل پلاون منو) یعنی سیلاب عظیم والے منو کے نام سے جانا جاتا ہے۔متسیہ پران ۱۵-۲:۱۴ میں ہے ''اے زمین کے محافظ! چاکشش منونتر کے دور قیامت میں جب ساری زمین ایک سیلاب میں غرق ہو جائے گی اور تمہارے ذریعہ مخلوق کی دوبارہ ابتداء ہوگی تب میں ویدوں کو نافذ کروں گا''۔سورہ نوح میں قوم نوح کے جن دیوی دیوتاؤں کا ذکر کیا گیا ہے **(وڈ۔صواع۔یغوث۔یعوق، نسر)** ان ناموں کے دیوی دیوتا ہندوستان کے علاوہ کہیں نہیں پائے جاتے،صرف ہندوستانی قوم ہی ان کی پوجا کیا کرتی ہے۔اس کے علاوہ بھی بہت سے شواہد ہیں جو اس بات کی تائید کرتے ہیں کہ وید حضرت نوحؑ پر اتارے گئے تھے جن کو بعد میں تحریف کا شکار بنادیا گیا۔

سناتن دھرمی کتابوں میں حضرت نوحؑ کے کشتی بنانے سے لیکر سیلاب کے بعد تک کے واقعات بڑی تفصیل سے ملتے ہیں جس سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت نوحؑ کی قوم ہمارے برادران وطن ہندو ہی ہیں۔ملاحظہ کریں بھوشہ پران، پرتی سرگ کا پہلا کھنڈ۔رگ وید۱۰-۱۱:۴۵:۵۔شت بتھ پران براہمن۔مہابھارت ون پرو۔متسیہ پران۔

اس کی پوری تفصیل کے لئے ''المعہد العالی الاسلامی'' حیدرآباد کے ۲۰۱۱ء کے قرآنی سیمینار کے مجموعہ بعنوان ''قرآن اور عصر حاضر'' میں سید عبداللہ طارق صاحب کا مقالہ'' بعنوان قرآن اور ہندو مذہبی کتب۔مشترکہ شخصیات کی تلاش'' ملاحظہ فرمائیں۔

آریہ تہذیب ایک منصفانہ جائزہ

آریوں سے پہلے ہندوستان میں جو تہذیب تھی اسے سندھ طاس تہذیب کہا جاتا ہے۔آریہ جو اس وقت ایران اور اس کے نواح میں بستے تھے افغانستان کے دروں سے ہندوستان پر حملہ آور ہوئے یہ دراوڈوں کے مقابلے زیادہ منظّم اور مہذب تھے اس لئے انھیں مغلوب کر کے اور یہاں کی دیگر اقوام کو پسپا کر کے ملک کے شمالی علاقوں تک محصور کر دیا۔یہاں سے ہندوستان کی سب سے بڑی تہذیب یعنی آریہ تہذیب کی ابتداء ہوتی ہے جو کہ مسلمانوں کے ملک پر اقتدار تک باقی رہی۔اگر چہ اس کے بعد بھی کئی اقوام مختلف مراحل میں یہاں داخل ہوئیں لیکن ان میں سے کوئی بھی آریہ تہذیب کی جگہ نہیں لے سکی۔(دی اسٹوڈنٹ آف انڈین ہسٹری از ڈاکٹر ایشوری پرساد:ص۲۴ تا۳۵)

عام طور سے آریوں کی تاریخ کا جو نقشہ کھینچا گیا ہے وہ اچھا نہیں ہے خاص کر بعض مسلم تجزیہ نگاروں نے آریہ تہذیب کو اس کے شروعاتی دور سے ہی نہایت ظالمانہ اور سفاکانہ تہذیب بنا کر پیش کیا ہے جو کہ حقیقت سے کافی دور ہے۔اس میں کوئی شک نہیں کہ آریوں نے ہندوستانی معاشرے کو چار حصوں میں تقسیم کیا تھا لیکن شروعاتی دور میں یہ تقسیم پیدائشی نہیں تھی بلکہ مختلف کاموں کے لئے چار طبقات

بنائے گئے تھے اور پھر ان کو ان کاموں کا ذمہ دار بنایا گیا تھا لیکن مرور زمانہ سے یہ تقسیم ذاتوں میں تبدیل ہوگئی اور پیدائشی تقسیم بنادی گئی۔ چنانچہ شروعاتی دنوں میں شودروں کو بھی اچھا مقام دیا جاتا تھا اور ان کے حقوق کا تحفظ کیا جاتا تھا لیکن بعد میں جب بگاڑ آیا تو شیطانی کارندوں نے مذہب پر اپنی اجارہ داری قائم کر کے ظلم وستم کی انتہا کردی۔ یہ سب کافی بعد میں ہوا لیکن ہمارے تجزیہ نگاروں نے تاریخ کے اس برے دور کو ہی قلمبند کیا اور اس سے پہلے کے آرین دور کا تجزیہ نہیں کیا جو انصاف پسندی اور مساوات کی ایک مثال تھا۔ یہ سب اصل تاریخ سے عدم واقفیت کی بنا پر ہوا، بالکل اسی طرح جیسے بعض غیر مسلم مؤرخین نے مسلمانوں کی تاریخ کو ظلم وستم اور خون خرابے کی تاریخ بنا کر پیش کیا ہے، جب ہم اسے ناانصافی کہتے ہیں تو پھر آریوں کی تاریخ کو بیان کرنے میں یہ ناانصافی کچھ ہماری طرف سے بھی ہوئی ہے۔

سناتن دھرم کی کتب کا مطالعہ بتاتا ہے کہ ویدک دور کے شروعاتی ایام میں لوگوں میں کوئی طبقاتی تقسیم نہیں تھی، تمام انسان ایک ہی طبقہ کہلاتے تھے، بعد میں کچھ وجوہات کی بنا پر معاشرے کو چار طبقات (ورن) میں تقسیم کر دیا گیا۔ برہدارنیک اپنیشد کی گیارہویں کاشیکا میں کہا گیا ہے کہ ''تخلیق کائنات کے وقت صرف ایک ہی برہمن طبقہ موجود تھا''۔

مہابھارت شانتی پرو ادھیائے ایک کا چودھواں شلوک ہے: ''برہمن الگ الگ کاموں کو اپنانے کی وجہ سے مختلف کاموں میں تقسیم ہوتے چلے گئے''۔

سناتن دھرم پر اب تک کی سب سے مضبوط اور منصفانہ تحقیق بودھ مذہب کے ایک آئی ایس آفیسر **جناب ڈاکٹر کے ایم سنت** (سے،نی) نے پیش کی ہے۔ انھوں نے اس عنوان پر کئی کتابیں لکھی ہیں۔ جہاں انھوں نے ہندو مذہب، اس کی کتابوں، اور اس کے دیوتاؤں کے کیریکٹر پر ایسی کھلی تنقیدیں کی ہیں، وہیں انھوں نے شروعاتی دور کے آریوں کی تہذیب کی تعریفیں بھی کی ہیں۔ وہ اپنی کتاب '' بھارتی سمویدھان بنام ہندو دھرم شاستر'' ص ۲۰ میں لکھتے ہیں: ''ویدک دور کے آریوں نے جو طبقاتی نظام قائم کیا تھا وہ پیدائشی نہیں تھا بلکہ کام کاج کی تقسیم کے لئے کیا گیا تھا اور ان چاروں طبقات کو زندگی کے مختلف میدانوں میں آزادی حاصل تھی، ان میں عدم مساوات نہیں تھی، بھید بھاؤ و چھوت چھات جیسی معاشرتی برائیاں نہیں تھیں، بلکہ آپس میں سب بھائی بھائی بن کر رہتے تھے'' (۱۲)۔ ایک جگہ لکھتے ہیں ''ہندو مذہبی کتب کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ شروعاتی دور میں برہمن، کشتری، ویش اور شودر کو تمام میدانوں میں برابری دی گئی تھی اسلئے شودر بھی راجہ بنائے جاتے تھے۔ بالمیکی رامائن میں برہمن، کشتری، ویش اور شودر تمام راجاؤں کا تذکرہ ملتا ہے''۔

آریوں نے یہ طبقاتی نظام کیوں قائم کیا تھا اس کا جواب دیتے ہوئے ص: ۱۸ پر لکھتے ہیں: ''دراصل آریہ جیسے جیسے تمدنی اور معاشرتی ترقی کرتے گئے تو رفتہ رفتہ ان کے علاقے بھی بڑھنے لگے۔ طاقت وقوت کی اس ترقی کے ساتھ انھیں حکومتی و معاشرتی سطح پر کئی سنگین مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔ جیسے کہ زمین و جائیدادوں کے جھگڑے شروع ہو گئے، تخت و تاج کے حصول کے لئے لڑائیاں ہونے لگیں۔ جس سے ان کا معاشرتی نظام درہم برہم ہونے لگا۔ چنانچہ آریوں کے مذہبی راہنماؤں اور اور قومی حکمرانوں نے اس مسئلہ کا حل تلاشنا شروع کیا۔ کافی غور وخوض کے بعد وہ سب اس نتیجے پر پہنچے کہ معاشرے میں بگاڑ پیدا کرنے والی چار چیزیں ہیں۔ جہالت، ناانصافی، بے روزگاری، اور سستی و کاہلی۔ اگر ان کا خاتمہ کر دیا جائے تو معاشرہ ہر طرح کے فساد سے محفوظ ہو جائے

گا۔لہٰذاانھوں نے ان چاروں چیزوں کے خاتمہ کے لئے چار طبقات بنائے ۔ انھوں نے جہالت کو دور کر نے کے لئے اساتذہ(برہمن)،نا انصافی کے خاتمہ کے لئے فوجی(کشتری)،بے روزگاری پر قابو پانے کے لئے تاجر (ویش)،اورسستی و کاہلی کو دور کر نے کے لئے سماجی کارکنان(شودر) بنائے۔اس طرح معاشرے میں پھر سے امن وامان قائم ہوگیا''۔

یہ طبقاتی تقسیم پیدائشی نہیں تھی بلکہ لوگوں کوان کے علم و ہنر اور ان کی قابلیت کے اعتبار سے کوئی ''ورن'' دیا جاتا تھا۔اگر کوئی علمی میدان سر کرتا تو برہمن بن جاتا ،فوجی تربیت پاتا تو کشتری کہلاتا،تجارت یا کھیتی باڑی کرتا تو ویش بن جاتا اوراپنا انتخاب بحیثیت سماجی کارکن کے کرتا تو شودر کہلاتا۔بھوشیہ پران ادھیائے ۴۰ شلوک ۴۸ میں ہے :''چاروں ورنوں کے لوگ اپنے علم و ہنر کے اعتبار سے اپنے ورن بدل سکتے ہیں''۔ کسی کے لئے یہ لازم نہیں تھا کہ وہ اپنے والدین کے ورن میں ہی رہے بلکہ ہر شخص کو یہ اختیار تھا کہ وہ اپنی مرضی سے اپناورن تبدیل کر سکتا تھا۔متسیہ پہران ادھیائے چار میں ہے کہ''منو کے بیٹے وامدیو تھے اور وام دیو کے بیٹے برہمن،کشتری،ویش اورشودر چاروں طبقات سے تعلق رکھتے تھے''۔

سناتن دھرم کے تعلق سے یہ تحقیقات حقیقت پر مبنی معلوم ہوتی ہے کیونکہ ہرقوم میں اس کے نبی کی تعلیمات کا اثر ایک عرصہ تک باقی رہا ہے اور جب اس قوم میں بگاڑ آیا تو وہ نبی اوراس کی تعلیمات کوفراموش کر بیٹھی۔لیکن اس سب کے با وجود ان کی کتابوں میں اسلامی تعلیمات کہیں نہ کہیں محفوظ رہیں ۔ چنانچہ رگ وید: ۵/۶/۵ میں ہے''انسانوں میں نہ کوئی بڑا ہے نہ چھوٹا سب آپس میں برابر کے بھائی بھائی ہیں،سب مل کر دنیاوآخرت کے لئے خدا کے بتائے کاموں پر عمل کریں''۔قرآن نے اسی بات کواس انداز سے کہا ہے " یا ایھاالناس انا خلقناکم من ذکر وانثیٰ وجعلناکم شعوباً وقبائل لتعارفوا،ان أکرمکم عند الله اتقٰکم" (سورہ الحجرات:۱۳)

وید میں قرآنی تعلیمات کے حوالے سے مزید تفصیل کے لئے دیکھیں علامہ سید عبداللہ طارق صاحب کی کتاب''ویداورقرآن،کتنے دور کتنے پاس''۔

مساوات کی تعلیم وید کے علاوہ دوسری مذہبی کتب میں بھی ملتی ہے۔چنانچہ مہابھارت شانتی پرو،ادھائے ۱۸۸میں کہا گیا ہے''طبقات میں کوئی عدم مساوات نہیں بلکہ برہما کے بنائے تمام انسان شروعات میں برہمن ہی تھے پھرعمل کی بنیاد پر الگ الگ تقسیم ہوئی''۔چاروں طبقات میں عدم مساوات نہیں تھی اس کا پتہ اس بات سے بھی چلتا ہے کہ چاروں طبقات کوعلمی ومذہبی کاموں میں حصہ لینے کی اجازت تھی۔یہاں تک کہ شودر طبقہ کےلوگ بھی اگر علمی صلاحیت حاصل کر لیتے تو برہمن ان کو وید کا درس دینے کی نہ صرف اجازت دیتے بلکہ وید کی جمع و تدوین میں بھی ان کی حصہ داری قبول کرتے۔چھاندوگیہ اپنیشد کے مطابق ایک شودر رشی''کوش'' نے وید کے کچھ منتر لکھے تھے۔تمام طبقات کو باہمی رشتے قائم کرنے کی اجازت تھی،وہ آپس میں شادیاں کرتے تھے۔چنانچہ سناتن دھرم کے بہت سے علماء وقائدین شودر خواتین کے بطن سے ہوئے،اور یہ کہیں نہیں ملتا کہ اس وقت کسی نے اس پراعتراض کیا ہو۔سناتن دھرم کی مشہور کتاب''بھوشیہ پران''، ورتہ پرو،ادھیائے ۴۲،شلوک ۲۲ تا ۲۸ کے مطابق'' کیورتا خاتون سے ویاس جی اور شواپا خاتون سے پراسر جی کی پیدائش ہوئی،اسی طرح شوکی خاتون سے شک دیواورالکی خاتون سے کرن رشی پیدا ہوئے۔اسی طرح منی سر یشتھا مند پال لویکا خاتون سے پیدا ہوئے اور یہ تمام

خواتین شودر طبقہ کی تھیں۔

آریوں میں عورتوں کا مقام:

آریوں کے دور میں عورتوں کو بلند مقام حاصل تھا۔اصل سناتن دھرم کے مطابق ان کے حقوق رکھے گئے تھے ۔ کے ایم سنت صاحب لکھتے ہیں ''پرانے زمانے میں آریہ سماج میں عورتوں کو بڑا مقام حاصل تھا، مردوں کو مخصوص حالات میں ہی ایک سے زائد نکاح کا اختیار تھا ،مردوں کی طرح عورتیں بھی طلاق (خلع) حاصل کرسکتی تھیں،اس وقت کا معاشرہ خواتین کے حقوق کی خلاف ورزی نہیں کرتا تھا۔عورتوں کو آزادی کے ساتھ زندگی گزارنے کا اختیار تھا،وہ مردوں کی محتاج اور بے سہارا بن کر نہیں رہا کرتی تھیں۔

اسی طرح خواتین کو حصول علم کی مکمل آزادی تھی،وہ گروکل کے مدارس میں نہ صرف مذہبی تعلیم حاصل کرتی تھی بلکہ وید کی معلّمہ کی حیثیت سے درس وتدریس کے فرائض بھی انجام دیا کرتی تھیں۔

حکومتی کاموں میں بھی خواتین کا بڑا دخل تھا یہاں تک کہ بادشاہ بنانے کی رسم خواتین کی موجودگی کے بغیر نہیں ہوا کرتی تھی۔(بھارتی سمویدھان بنام ہندو دھرم شاستر؛ص۲۳)

آریوں میں بگاڑ کی شروعات:

تاریخی شواہد بتاتے ہیں کہ راجہ رام چندر جی کے والد راجہ دشرتھ کے دور تک ہندوؤں میں مروجہ ان چاروں طبقات میں اتنی عدم مساوات نہیں تھی جس قدر بعد کے دور میں آ گئی ۔راجہ دشرتھ کے زمانے تک شودروں کو بھی بادشاہت کا حق حاصل تھا۔چنانچہ بالمیکی رامائن میں ہے کہ راجہ دشرتھ نے ایک مرتبہ تمام راجاؤں کی دعوت کی تھی جس میں شودر راجہ بھی شامل تھے۔آریوں میں جو اخلاقی بگاڑ آیا اس کا سب سے بڑا مظہر ''رام چندر جی'' کی بادشاہت کے آخری ایام میں ہوا جب ایک شودر عالم ''شمبو جی مہاراج'' کو رام چندر جی سے کسی بات پر اختلاف کرنے کی وجہ سے قتل کرادیا گیا۔یہاں سے شودروں پر مظالم کی شروعات ہوئی اور آہستہ آہستہ اسی دور میں شودروں کی تپسیہ (مذہبی امور کی ادائیگی) پر پابندی عائد کردی گئی اور اب شودروں کے گھر میں شودر اور برھمن کے گھر میں برھمن پیدا ہونے لگے(بحوالہ سابق:ص۲۸)۔پھر رفتہ رفتہ آریوں کی اخلاقی گراوٹ یہاں تک پہنچ گئی کہ ان کے مذہبی طبقہ برہمن نے باقی تمام طبقات پر امتیاز کا اعلان کردیا اور ساتھ ہی ساتھ شودروں کی غلامی کا فیصلہ بھی سنادیا گیا۔اسی پر بس نہیں کیا گیا بلکہ اس فیصلے کو خدائی فیصلے کا نام دیا گیا جس کے لئے بڑی ہوشیاری سے ایک برہمن گرو ''منو جی'' سے ایک آئین مرتب کرایا گیا جسے ہر ہندوستانی باشندے پر لاگو کردیا گیا ۔اس آئین نے برہمنوں کو افضل البشر کا درجہ دیا اور شودروں سے ان کا حق زندگی تک سلب کر لیا ۔اسی قانونی دستاویز کو ''منواسمرتی'' کہا جاتا ہے۔جس کے بعد کمزور طبقات پر جو ظلم ہوا اس کی داستانیں رونگٹے کھڑے کردینے والی ہیں۔

کسی قوم میں جب بگاڑ آتا ہے تو اس کی زد میں معاشرے کے دوسرے افراد بھی آتے ہیں ۔چنانچہ اس بگاڑ نے عورتوں کو بھی بری طرح متاثر کیا،انکو ان کے بنیادی حقوق تک سے محروم کردیا گیا اور ان کے لئے مردوں کی غلامی لکھ دی گئی ۔ اس دور کے برہمنوں کا حال یہ تھا کہ اپنی بیویوں کو فروخت تک کرڈالتے تھے،اور جوئے میں انھیں رہن تک رکھ دیا کرتے تھے۔جیسے کہ کوروؤں نے پانڈوؤں کے پاس اپنی بیویوں کو رہن رکھ دیا تھا،جن کو وہ جوئے میں ہار بیٹھے تھے جس کے بعد ہندوستانی تاریخ کی سب سے خونریز جنگ لڑی گئی جسے ہم ''کرکشیترا'' اور ''مہا بھارت'' کے نام سے یاد کرتے

ہیں۔ آریوں کا بگاڑ یہاں تک جا پہنچا تھا کہ بھائی اپنی شادی شدہ بہن سے ناجائز تعلقات بنانے لگے۔ بھوشیہ پران میں ہے کہ ''النکا رشی'' کی بیوی سے اس کے بھائی کے ناجائز تعلقات تھے۔ رشی جو قوم کے راہنما ہوتے ہیں ان تک کا حال یہ تھا کہ برسر عام جماع کو فعل محمود سمجھتے تھے۔ مہا بھارت کے آدی پورو، ادھیائے ۶۳ کے مطابق ''رشی پاراسر'' نے کھلے عام عوام کے سامنے جماع کیا تھا۔ مہابھارت میں آگے ادھیائے ۱۰۴ کے مطابق رشی ''دیرتھما'' نے بھی ایسی ہی حرکت کی تھی۔ بلکہ کسی عورت کے دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے رشی منی اپنی جنسی خواہش جانوروں سے پوری کرنے لگے تھے۔ مہابھارت کیا آدی پروادھیائے ۱۰۰ میں ہے کہ ''وبھنڈ کا'' رشی نے ہرنی کے ساتھ جماع کیا تھا۔

ہندو قوم پر مسلمانوں کا احسان:

بگاڑ کی یہ صورتحال صدیوں تک باقی رہی، مختلف خاندانوں کی حکومتیں بدلتی رہیں۔ کبھی کسی ودسرے مذہب کو بھی بالا دستی حاصل ہوئی جیسے راجہ اشوک کے دور میں بودھ مذہب کو غلبہ ہوا اور مہاویر جین نے بھی ان معاشرتی برائیوں کے خلاف علم بغاوت بلند کیا، لیکن وہ سب معاشرہ کو ان برائیوں سے نہیں بچا سکے۔ یہاں تک کہ اسلام (حقیقی سناتن دھرم) کا سورج کفر وشرک کی گھٹاؤوں کو چھانٹ کر پھر سے طلوع ہوا جس نے اپنی کرنوں سے ہندوستان کی سرزمین کو پھر سے روشن کیا اور جہاں جہاں اس کی کرنیں پہنچیں وہاں سے ظلم وستم اور کفر وشرک کے بادل چھٹتے چلے گئے۔ جب مسلمان اس ملک میں آئے تو انھوں نے دیکھا کہ جن انسانوں کو اللہ نے آزاد پیدا کیا تھا انھیں یہاں کے ایک خاص طبقے کا غلام بنا دیا گیا ہے۔ مسلمانوں نے اس ظالمانہ نظام کے خاتمے کی جی جان سے کوششیں کیں اور جب ان کو یہاں اقتدار نصیب ہوا تو انھوں نے منوسمرتی کے اس غیر انسانی قانون کو جڑ سے ختم کر کے اسلام کا نظام مساوات اور نظام عدل وانصاف قائم کیا، یہاں کے باشندوں کو ان کے مالک وخالق سے متعارف کرایا۔ مسلمان ہی تھے جنھوں نے کمزور طبقات سے مذہبی پابندیاں ختم کیں، زندگی کے ہر میدان میں تمام ہندوستانیوں کو یکساں حقوق دئے۔ جب تعلیم سے برہمنوں کی اجارہ داری ختم ہوئی تو دلتوں نے بھی اس میں بھر پور حصہ داری کی اور کہیں کہیں برہمنوں سے بھی آگے نکل گئے۔ مسلمانوں نے عورتوں پر بھی احسان کیا پہلے وہ مردوں کے پابند سلاسل تھیں ان کی حالت نہایت ابتر تھی انھیں آزاد کرواکے ردائے عزت عطا کی، معاشرے میں انھیں خود کفیل بنایا اور وہ تمام حقوق ومراعات واپس دلائیں جن سے انھیں محروم کر دیا گیا تھا۔

مسلمانوں کے اس عدل وانصاف، عملی مساوات اور مذہبی رواداری سے متأثر ہوکر لاکھوں لوگ اسلام میں داخل ہوئے۔ ملک مسلمانوں کے ہاتھ آیا تو ہر طرف امن وامان قائم ہوگیا، تمام اشیاء ضرور یہ نہایت ارزاں کر دی گئیں، مسلمانوں نے ملک کی صنعت وحرفت، تجارت اور فن تعمیر کو اتنی ترقی دی کہ ہندوستان دنیا بھر میں سونے کی چڑیا کے نام سے مشہور ہوگیا، عسکری طاقت کو اس بلندی پر پہونچایا کہ عثمانی ترکوں کے بعد دنیا کا سب سے طاقت ور ملک بن گیا۔ جب ملک میں خوشحالی آگئی اور مذہبی رواداری کی مثالیں چوطرفہ پیش کی جانے لگیں تو ہندو مسلم سکھ عیسائی سب میں پیار ومحبت کے رشتے قائم ہو گئے اور ملک جنت نما بن گیا۔ اسلام اور مسلمانوں کا اس ملک پر سب سے بڑا احسان خدا شناسی، عدل وانصاف کا قیام اور غلامی کا خاتمہ ہے۔

ہندومت اور سناتن دھرم دو متفرق چیزیں:

آج کا مروجہ ہندومت اور سناتن دھرم دو متفرق

چیزیں ہیں کیونکہ دونوں کے درمیان بنیادی اختلاف توحید اور شرک کا اختلاف ہے، سناتن دھرم مورتی پوجا سے روکتا ہے اور ہندومت اس کی تعلیم دیتا ہے۔ سناتن دھرم رسالت اور آخرت کا یقین دلاتا ہے اور ہندو مت اوتار واد اور پنر جنم کا داعی ہے۔ چنانچہ سناتن دھرم کا نام بدل کر ہندومت کیا جانا ہندوستانی تاریخ کا سب سے بڑا فراڈ ہے۔ ہندو لفظ کا استعمال اگر چہ کچھ ہندو کتابوں میں بھی ہوا ہے لیکن ہندو قوم کو ہندو کہے جانے کی اصل وجہ یہ ہے کہ عرب ہندوستانی باشندوں کو ہندی کہہ کر مخاطب کرتے تھے جیسا کہ آج بھی وہ ہندوستانیوں کو بلا تفریق مذاہب ہندی ہی کہا کرتے ہیں۔ جب وہ ہندوستان پر قابض ہوئے تو یہاں کی بت پرست قوم کو بھی ہندی کے نام سے مخاطب کیا۔ لہٰذا مرور زمانہ سے یہ نام ہندی سے ہندو ہو گیا اور ایک قوم کے لئے مخصوص ہو گیا۔

ہندو مذہبی تاریخ کا جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ ہندوؤں میں مشرکانہ عقائد، مورتی پوجا، عجیب و غریب رسم ورواج اور توہمات کو فروغ دینے میں ان کے مذہبی رہنماؤں کا بڑا کردار ہے۔ انھوں نے مذہب پر اپنی جارہ داری قائم رکھنے کے لئے ان تمام چیزوں کو عوام میں رواج دیا جس کے ذریعے وہ عوام کے دل و دماغ پر قابض ہوتے گئے۔ ایک عجیب سا ڈر لوگوں کے دل و دماغ پر مسلط کر دیا گیا جس کی وجہ سے لوگ مذہبی رہنماؤں کے غلام بن گئے اور صورتحال یہاں تک پہنچ گئی کہ ہندو قوم میں پیدا ہونے والا کوئی شخص اپنے پنڈتوں کی مرضی کے بغیر اپنی زندگی کا کوئی بڑا فیصلہ نہیں کر سکتا تھا۔ ویدا اور ایسی مذہبی کتابیں جو اصل سناتن دھرم کی تعلیم دیتی ہیں عوام کی ان تک رسائی کو ناممکن بنا دیا گیا۔ اس کے لئے شروعاتی دور میں پروانوں میں تحریف کی گئی اور پھر آخری دور میں ''رام چرتر مانس'' جیسی کتابیں مدون کی گئیں تا کہ کوئی شخص بھی ہندو پنڈتوں کے بنائے اس جال سے نہ نکل سکے۔ ہندو قوم پر مسلمانوں کا ایک بڑا احسان یہ بھی ہے کہ انھوں نے اس مذہبی غلامی کے طلسم کو توڑا اور اپنے ہندو بھائیوں کو اس سے آزادی دلائی اور تعلیم سے برہمنوں کی اجارہ داری ختم کر کے سب کے لئے عام کر دیا۔ آج ہندو معاشرے میں جو تعلیمی بیداری پائی جاتی ہے وہ سب مسلمانوں کی دین ہے۔

خلاصہ کلام:

اس تحریر میں سناتن دھرم اور اسلام کے تئیں دونوں قوموں میں پائی جانے والی جن بڑی غلط فہمیوں کا ازالہ کیا گیا ہے اگر اس کو عام کر دیا جائے تو ملک میں امن وامان پھر سے قائم ہوسکتا ہے اور موسم بہار پھر سے لوٹ سکتا ہے۔ لیکن اس کے لئے ضرورت ہے کہ برادران وطن کو ان حقائق سے واقف کرایا جائے کہ۔

۱۔ اسلام پردیسی نہیں بلکہ وہی ہندوستان کا قدیم مذہب (سناتن دھرم) ہے جس کو بعد کے لوگوں نے تحریف کر کے بالکل مسخ کر دیا اور جواب مکمل اور آخری شکل میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آئے ہیں۔

۲۔ آریائی تہذیب کا شروعاتی دور نہایت درخشاں اور عدل وانصاف سے مزین تھا، وہ ایک بے مثال تہذیب تھی جو بگاڑ کے بعد تاریخ کی بدترین تہذیب بن گئی۔

۳۔ ہندوستان پر مسلمانوں کے بے شمار احسانات ہیں ان میں سے سب سے بڑا احسان خدا شناسی، عدل و انصاف کا قیام، تعلیمی آزادی اور ذہنی وجسمانی غلامی کا خاتمہ ہے، اگر مسلمان نہ آتے تو یہ ملک آج بھی تعلیم سے دور ایک طبقاتی غلامی میں جی رہا ہوتا۔

☆☆☆

تعارف و تبصرہ

''بچوں کی تربیت کے رہنما اصول'' ایک تأثر

از: مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن الاعظمی دامت برکاتہم

''بچوں کی تربیت کے رہنما اصول'' ایک تأثر

تالیف: ڈاکٹر مامون مبیض

ترجمہ: ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی

یہ ایک متفق علیہ مسئلہ ہے کہ بچے کی نفسیاتی تربیت رحم مادر سے شروع ہوجاتی ہے، اور ماں کے ماحول، ان کے خیالات و افکار کا اثر بچے کے ذہن پر پڑنا شروع ہوجاتا ہے، ماں اگر تعلیم یافتہ اور مثقف ومہذب خاندان کی تربیت یافتہ ہوتی ہے، تو اس کے اثرات پیدا ہونے والے بچے میں روز اول سے اپنی مختصر اور ناقابل التفات حرکات وسکنات کے ذریعہ غیر شعوری طور پر پڑنا شروع ہوجاتے ہیں۔

جس خاندان کے لوگ علم وعمل کی جامعیت اور معاملات زندگی میں اعتدال ومیانہ روی پر گامزن ہوتے ہیں، ان کے بچے بھی ان صفات سے متأثر ہوتے ہیں، اس کے برعکس جس خاندان کے لوگ بے قاعدہ زندگی گذارتے ہیں اور بااصول ہونے کا عمل ان کے اندر مفقود ہوتا ہے، اس کے بچے بھی بے راہ روی میں نفسیاتی طور پر مبتلا ہوجاتے ہیں۔

لیکن خاندانوں کے باہر تعلیم گاہوں اور سوسائٹی کے دیگر مراکز بچے کے باشعور ہونے کے بعد اثر انداز ہوتے ہیں، جس کا مشاہدہ ہر دور میں اور ہر ملک میں کیا جاتا ہے، اسی لئے شعوری منزل شروع ہونے کے ساتھ بچے کی تربیت کا اہتمام کرنا ازحد ضروری ہے، تاکہ وہ اپنی ابتدائی زندگی کی تعمیر میں غیر شعوری طور پر حصہ لے سکے۔

یہی وجہ ہے کہ والدین اور خاندانی ماحول کے غیر تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود، باہر کی تعلیم وتربیت بچے کو ایک نئی زندگی اور امنگ دیتی ہے، دیکھا گیا ہے کہ اس طرح کے خاندانوں کے بچے بڑے ہونے پر لوگوں اور سوسائٹی کے ہر فرد کا مرکز توجہ بنتے ہیں، اور بڑے عہدوں پر فائز ہوکر خاندان کا نام روشن کرتے ہیں، لیکن خاندان کے افراد میں دیگر خوبیاں ہونے کے باوجود اگر وہ سیرت سازی کے عمل سے ناآشنا ہیں، اور ان کے ماحول میں ہر طرح کی رطب ویابس باتیں ہوتی رہتی ہیں، تو باوجود تعلیم یافتہ ہونے کے اس باشعور بچے میں بھی اجتماعی برائیوں اور زبان کی لغزشوں کا عنصر قائم رہتا ہے، اور وہ بجائے تعمیری کردار کے آپسی چپقلش اور باہمی نزاع واختلافات کی بنیاد بن جاتا ہے۔

عصر نبوی علی صاحبہ الصلاۃ والسلام میں دعوت اسلامی اور اخوت والفت کو روکنے کے لئے کفار مکہ نے شروع میں ہر طرح کی بے سروپا باتوں کو رواج دیا، اور بچوں کے ذہن کو اس پاکیزہ دعوت کی فضا سے روکنے کے لئے کس طرح بہتان تراشی اور جھوٹے الزامات اور اس مقدس عمل کو روکنے کے لئے آمادہ کیا، اور پورے معاشرہ کو اس سے محروم رکھنے کے لئے زبان وبیان کو تخریبی سرگرمیوں میں صرف کیا۔ آپ اس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں۔

بچے شروع ہی سے اپنے ماحول سے متأثر ہوتے ہیں، اور بڑوں کو دیکھ کر اس تأثر میں ان کو کتنا حوصلہ ملتا ہے، اس کو بتانے کی ضرورت نہیں، ہمارے اس متمدن دور میں ذرائع

ابلاغ شروع ہی سے بچوں کی نفسیات، ان کی سرگرمیوں اور زندگی کے جملہ معاملات میں اثر انداز ہوتے ہیں، اور عام طور پر اس کو تعمیری کاموں میں استعمال نہ کرنے اور بچوں کے لئے اس کو ایک کھلونے کی حیثیت دینے کا رواج عام ہوگیا ہے، اس کی وجہ سے نہ صرف انفرادی برائیاں عام ہورہی ہیں، بلکہ اجتماعی حیثیت سے اس کے نقصانات اظہر من الشمس ہیں، اور خاندانوں کی تخریب کاری کا ایک ناقابل اصلاح ذریعہ بن چکے ہیں۔

یہ کتاب ''بچوں کی تربیت کے رہنما اصول'' ایک تعمیری اور اصلاح معاشرہ کی عظیم اور مثبت کوشش ہے، جو ہمہ گیر ہونے کے ساتھ ایک قابل رشک دعوتی عمل ہے، ہمارے مخلص ساتھی اور دوست جناب ڈاکٹر طارق ایوبی ندوی صاحب نے اس کو اردو کا ایک بہترین اور خوبصورت لباس عطا کیا ہے، یہاں تک کہ ترجمہ کی خوبی اصل کتاب کی تاثیر سے کئی درجہ زیادہ ہے۔

مجھے امید ہے کہ یہ علمی اور تربیتی کوشش ہر جگہ مقبول ہوگی، اور اس پر عمل کر کے بچوں کے مستقبل کو ہر اعتبار سے روشن کرنے میں اس کا ایک بڑا اور مثبت کردار ادا ہو سکے گا، اللہ تعالی سے دعا ہے کہ وہ اس ایجابی عمل کو قبولیت سے نواز کر اس کا حق ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائیں (آمین)

☆☆☆

نام کتاب: **بچوں کی تربیت کے رہنما اصول**
(نفسیاتی اصولوں کی روشنی میں)

اردو ترجمہ: (اولادنا من الطفولة الى الشباب : ڈاکٹر مامون مبیض)

مترجم: ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی صاحب

صفحات: ۴۲۴

مطبوعہ: حجۃ الاسلام اکیڈمی، دیوبند ۲۰۱۹ء

قیمت: ۳۰۰/روپے

مبصر: ڈاکٹر عبید اقبال عاصم

بچے قدرت کا انمول تحفہ ہیں، اللہ تعالی نے تخلیقی طور پر ان کی سرشت میں بہت سی صلاحیتیں ودیعت کی ہیں لیکن چونکہ بچوں کی نفسیات سے ہر انسان مکمل واقفیت نہیں رکھتا اس لیے بسا اوقات یہ صلاحیتیں ضائع ہوجاتی ہیں اور نسل انسانی مستقبل کے ایک امکانی عظیم انسان سے محروم ہوجاتی ہے۔

بچے پیدائشی طور پر انتہائی معصوم ہوتے ہیں "کل مولود یولد علی الفطرة فابوه یهودانه او ینصرانه او یمجسانه" کے مطابق تخلیقی اعتبار سے ہر ایک بچے کا ذہن تغیر و تبدل پذیر ہوتا ہے، وہ حالات، مشاہدات، مناظرات، اپنے بڑوں کے طرزِ عمل، اٹھنے بیٹھنے، چلنے پھرنے اور ایک دوسرے کی باہمی گفتگو سے بہت کچھ سیکھتا ہے۔ بچپن میں اس کے ذہن پر جو نقوش مرتسم ہوجاتے ہیں وہ تقریباً انمٹ ہوتے ہیں، ماہرین اطفال نے اس سلسلے میں اپنے اپنے تجربات پیش کیے ہیں اور یہ نتائج اخذ کیے ہیں کہ کمہار کے برتن کی طرح اس خام مٹی کو جس سانچے میں ڈھال دیا جائے اسی سانچے میں یہ برتن کی شکل میں ہمارے سامنے آجاتا ہے۔

ہندوستانی مسلم معاشرے میں گذشتہ کچھ سالوں سے ہی یہ شعور بیدار ہوا ہے کہ بچوں کی ابتدائی پرورش کا نفسیاتی لحاظ سے مطالعہ کیا جائے اور والدین کو یہ باور کرایا جائے کہ وہ بچوں کی اس انداز میں شروع سے ہی پرورش و پرداخت کریں جس میں اسے دیکھنے کے خواہش مند ہیں چونکہ پہلے یہ موضوع بحث کے لائق ہی نہیں سمجھا جاتا تھا اسی لیے اس طرف کوئی توجہ نہیں دی گئی لیکن انگریزی، جرمنی، فرانسیسی لٹریچر میں یہ موضوع شروع سے ہی قابل التفات رہا ہے اسی لیے ان کے یہاں اس سلسلے میں کافی مواد ملتا ہے۔ حالانکہ یہ مسلموں کی متاع گم شدہ نہیں بلکہ مذکورہ بالا قولِ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق ایک قیمتی خزانہ تھی جس کو ہم نے قابل قدر نہیں جانا اور مسلم قلم کاروں نے نفسیاتی تجزیہ نگاروں نے اس طرف سے بے اعتنائی برتی جس کے نتیجہ

میں مسلم معاشرے کی اکثریت بے حسی اور بے سمتی کا شکار ہوئی، البتہ گذشتہ صدی میں مسلم ماہرین نفسیات نے مسلمانوں کو اس سلسلہ میں بیدار کیا تو الحمدللہ مسلمانوں میں بالعموم تو نہیں مخصوص پیمانے پر یہ شعور بیدار ہوا۔

بچوں کی نفسیات کے سلسلے میں اردو زبان وادب میں زیادہ مواد فراہم نہیں ہوتا، بچوں کے چند ادبی رسالے گذشتہ صدی میں منظر عام پر آئے، کچھ کتابیں لکھی گئیں، مضمون نگاروں نے بھی اس موضوع پر اپنی نگارشات لکھیں لیکن یہ آٹے میں نمک کے برابر بھی نہ ہوسکا۔

عربی ادب میں ''ادب اطفال'' شروع سے ہی توجہ کا موضوع رہا اور بچوں کی تعلیم وتربیت کے سلسلے میں وہ بہت کچھ لکھا گیا، جس سے بچوں کی ذہن سازی ہوسکے، ان کی نشوونما اور تعلیم و تربیت میں معاون ہو لیکن نفسیات کو پیش نظر رکھتے ہوئے ان کے ذہن کو پڑھنا اور اسی کے مطابق ان کی ایسی تربیت کرنا جس سے وہ ایک صالح معاشرہ کا صالح فرد بن سکیں، اس طرف کم ہی توجہ دی گئی، اس پس منظر کو ذہن میں رکھتے ہوئے ڈاکٹر مامون مبیض صاحب کی کتاب "اولادنا من الطفولة الى الشباب" ایک بیش قیمت سرمایہ معلوم ہوتی ہے جس کا اردو ترجمہ موسومہ ''بچوں کی تربیت کے رہنما اصول'' (نفسیاتی اصولوں کی روشنی میں) بلکہ بہ توضیح مترجم (ترجمانی) ہے مامون مبیض صاحب کی کتاب ۱۹۹۸ء میں پہلی بار عربی زبان میں شائع ہوئی، اس کے ترجمہ کی توفیق ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی صاحب کو ہوئی اور اللہ نے اس کی طباعت واشاعت کا فریضہ حجۃ الاسلام اکیڈمی دیوبند کے جواں سال ڈائرکٹر ڈاکٹر محمد شکیب قاسمی کے سپرد کیا جس کے لیے "الدال على الخير كفاعله" کے بموجب سبھی مبارکباد کے مستحق ہیں۔

ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی صاحب دورِ حاضر کے اُن ''لکھاڑیوں'' میں شمار ہوتے ہیں جو اپنے اشہب قلم اور فکری جولانیوں کی وجہ سے عربی واردو حلقوں میں یکساں مقبول ہیں، ماہنامہ ''ندائے اعتدال'' ان کی تازہ بہ تازہ جیتی جاگتی تحریروں کا مثالی شاہکار ہے، اردو، ہندی، عربی وانگریزی میں ایک درجن سے زائد کتابوں کے مصنف، مؤلف ومبصر ہونے کے علاوہ کم و بیش نصف درجن بلند پایہ عربی کتابوں کے مترجم بھی ہیں، علاوہ ازیں بہت سی کتابوں کی ترتیب و تقدیم بھی موصوف کی علمی قابلیتوں کا بیّن ثبوت ہے۔ ڈاکٹر مامون مبیض صاحب کی کتاب "اولادنا من الطفولة الى الشباب" کو موصوف نے اردو جامہ پہنا کر اردو دنیا پر احسانِ عظیم کیا ہے۔

پیش نظر کتاب کے ناشر حجۃ الاسلام اکیڈمی، دیوبند اور اس کے منتظم اعلیٰ مولانا ڈاکٹر محمد شکیب قاسمی صاحب بھی اس کی اشاعت پر مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے وقت کی ایک اہم ترین ضرورت کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس ترجمہ کو اردو دنیا تک پہنچانے میں آسانیاں فراہم کیں۔

راقم نے اگرچہ اصل کتاب کو نہیں دیکھا لیکن ڈاکٹر محمد طارق ایوبی صاحب کے ذوقِ مطالعہ، فکری وسعت، قلمی نگارشات، علمی محاضرات، تعلیمی تجربات، ملی احساسات اور جذبۂ خدمت سے بخوبی واقف ہے، اس لیے اس ترجمہ کو دیکھ کر یہ بات صدفی صد کہی جاسکتی ہے کہ یہ ادب اطفال میں ہی نہیں بلکہ اردو ادب میں بھی ایک خوشگوار اضافہ ہے اور بچوں کی نفسیات پر بھی ایک مؤثر ترین کتاب ہے۔

یہ اردو ترجمہ ۴۲۴ صفحات پر مشتمل ہے، جس میں ابتدائی چوبیس صفحات میں کتابی ضروریات، عرضِ ناشر، پیش لفظ، عرض مترجم اور مقدمۂ مؤلف میں کتاب کی غرض وغایت اور اس کی ضرورت واہمیت تمام چیزوں کا لحاظ کیا گیا ہے، کتاب کے چار ابواب تربیت اولاد اور گھریلو زندگی سے متعلق تمہیدی گفتگو، نشوونما کے مختلف پہلو، بچپن کے ابتدائی سالوں میں تربیت میں پیش آنے والی مشکلات اور فن تربیت کے کچھ پہلو سے معنون ہیں۔ ہر باب کے ذیل میں بہت سی فصلیں ہیں اور ہر فصل بہت زیادہ مفید، نصیحت آمیز کلمات بچوں کی نفسیات اور ان سے ماخوذ تجربات کا خلاصہ ہے، جسے مؤلف محترم نے نہایت عرق ریزی کے ساتھ جمع کیا ہے اور فاضل ترجمہ نگار نے بہت ہی سہل اور دل

نشیں انداز میں بیان کیا ہے، اس پر مستزاد وہ آٹھ جداول ہیں جن میں مؤلف ومترجم نے محنت وریاضت سے بچوں کے مسائل، ان کی نفسیات، اس سلسلے میں والدین کے طرزِ عمل اور ان کے مناسب ترین حل کو پیش کیا ہے۔

پہلے باب میں پانچ فصلیں ہیں جو کتاب کے لکھنے کی وجوہات کے ساتھ ساتھ زندگی کے اس عجیب پرشوق سفر کی مختصر ترین داستان کی بھی بیان کرتی ہے، جس کے نتیجے میں اولاً وجود میں آتی ہے اور ہونے والے بچے کے والدین کو یہ ہدایات بھی فراہم کرتی ہے کہ ایسے مواقع کو کس طرح مفید وکارآمد بنایا جائے اور والدین کا کردار نومولود کے ساتھ کیسا ہونا چاہیے۔ موصوف نے اس موقع پر جس نکتہ کی طرف اشارہ کیا ہے وہ یقینی طور پر اہمیت کا حامل ہے، فرماتے ہیں کہ:

''نومولود کے سلسلے میں والدین کا نظریہ حقیقت پسندانہ ہو، اس کی آمد سے ان کی زندگی میں جو بنیادی تبدیلی ہوگی اسے بھی حقیقت کی نظر سے دیکھیں، والدین کا فرطِ شوق کے ساتھ نومولود کا استقبال اور اس کے ساتھ زندگی گذارنے سے محظوظ ہونا فطری ہے، مگر اس وجودِ شوق اور فرطِ مسرت میں ان کو حقیقت پسندی کا دامن نہیں چھوڑنا چاہیے''۔ (۴۷)

بچہ وجود میں آنے کے بعد جن مراحل سے گذرتا ہے ان میں اس پر کس طرح توجہ دی جائے اور کن امور کا خیال رکھتے ہوئے اس کے لیے وہ کیا تدابیر اختیار کی جائیں جن سے اسے بڑا ہونے تک اپنے اندر ''ایک ذمہ دار شہری'' کے احساس کو تقویت مل سکے ان تمام احوال وکیفیات کو دوسرے باب کی بارہ فصلوں میں پیش کیا گیا ہے جن کی ابتدا ''اپنی ذات اور اپنے جذبات کے تئیں بچے کا احساس'' سے ہوتی ہے۔ یہی اس کی ''شخصیت کی تغیر وتشکیل'' میں معاون ہوتی ہے، جس سے اس کے ''مزاج'' کا پتہ چلتا ہے، ''شعور کی نشوونما'' سے شروع ہونے والا ''زندگی کا ابتدائی سفر'' ''تسلسل اور محبت واعتماد'' کے سایہ میں ''زبان وکلام''، ''ذہانت''، ''اخلاقی روحانی''، ''جنسی'' اور ''اجتماعی تعلقات'' کی نشوونما سے ہوتے ہوئے ''خوف'' کی نفسیات کو ''کھیل'' میں تبدیل کردیتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ بارہ فصلیں شاید بچے کے ابتدائی بارہ سالوں کے پیش نظر لکھی گئی ہیں جو بہت زیادہ اہمیت کی حامل ہیں۔ مؤلف ومترجم دونوں اس بات کے لیے لائق تحسین وآفریں ہیں کہ انھوں نے ان معصوم بے زبان بچوں کے ذہن ودماغ کا گہرا مطالعہ کرکے اپنے علمی مشاہدات وتجربات کو کاغذ وقلم کی زینت بنا کر دنیا کے سامنے پیش کیا اور ناتجربہ کار والدین کو یہ مواقع فراہم کئے کہ وہ اس کتاب کی مدد سے کس طرح اپنے بچوں کو پروان چڑھائیں، خصوصی طور پر ''جنسی نشوونما'' میں مؤلف نے بچوں کے اندر پائی جانے والی پرتجسس، ذہنیت اور اس کے نتیجے میں اس میں پائی جانے والی مختلف الاحوال کیفیات اور ان سے متفکر والدین کے رویہ اور ان فطری مسائل کے بہترین حل کو قارئین کے سامنے جس انداز سے پیش کیا ہے وہ اردو قارئین یا برصغیر کے عام مسلموں کے کے لیے غور وفکر کی نئی راہیں فراہم کرتا ہے، مؤلف کے خیال کی ترجمانی مترجم نے اس انداز سے کی ہے کہ:

''جنس انسانی زندگی کا ایک طاقتور حصہ ہے، اس کا اپنا کردار ہے، اس کے لیے اصول وضوابط ہیں، چنانچہ جو اس سلسلے میں نظم وضبط کا خیال نہ رکھے گا وہ ہلاک ہوگا جنس ہی مرد وعورت کے درمیان میاں بیوی کی حیثیت سے ربط وتعلق کا سبب ہے جس میں محبت ورحمت جاگزیں ہوتی ہے اور یہ تعلق اللہ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے، ارشادِ باری ہے: "ومن آياته ان خلق لكم من انفسكم ازواجا لتسكنوا اليها وجعل بينكم مودة ورحمة"۔ (ص۱۶۵)

تیسرا باب ''بچپن کے ابتدائی سالوں میں پیش آنے والی مشکلات'' سے متعلق ہے اس میں تین فصلیں ہیں جن سے ہر ذی نفس کو گذرنا پڑتا ہے اور یہ وہ مراحل ہیں کہ جن پر اگر بچپن میں صحیح توجہ نہ دی جائے تو مستقبل میں بہت سی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ سونا، کھانا پینا اور ضروریات سے فراغت زندگی کا لازمی تقاضا ہیں اگر بچہ ان تینوں مراحل کو صحیح طریقہ سے انجام نہیں دیتا تو وہ بدتمیز وبدتہذیب یا بیمار ذہنیت کی علامت سمجھا جاتا ہے، اسی لیے

مؤلف نے اس باب پر خاص زور دیتے ہوئے بچوں کے والدین و سرپرستوں کو مفید مشورے دیئے ہیں، جن کو لائق و فاضل ترجمہ نگار نے ترتیب سے نو نکات میں تقسیم کیا ہے جس کا خلاصہ بایں طور کیا جاسکتا ہے کہ بچوں کو منانا اور سلانا ایک مفید عمل ہے اسے سزا کے طور پر استعمال نہیں کرنا چاہیے بلکہ والدین کو یہ کوشش کرنی چاہیے کہ وہ کچھ ایسے کام کریں جس سے بچے کو فرحت حاصل ہو اور بستر پر آنا اس کے لیے پرکشش بن جائے۔ والدہ کو یہ چاہیے کہ وہ بچہ کو بستر پر بلانے کے لیے اسے کہانی سنانے کا لالچ دے، سونے سے قبل بچے کو سورۂ فاتحہ، معوذتین اور سونے کی دعا پڑھانی چاہیے تاکہ بچے کے ذہن میں یہ چیزیں راسخ ہو جائیں اور وہ ان پر تاحیات عمل کرتا رہے، بچے کی نیند کے وقت کا خیال رکھنا بھی ضروری ہے اور یہ بھی کوشش ہونی چاہیے کہ اس کا کمرہ پرکشش ہو۔ الغرض یہ ''اصول نہگانہ'' اور ان کی تفصیلات وتشریحات، قیمتی پند ونصائح ہیں جنھیں کتاب کے ص ۲۰۸ سے ۲۱۴ تک دیکھا جا سکتا ہے، اسی طرح کھانے میں مشکلات پیدا کرنے والے بچوں کے ساتھ تعامل اور قضائے حاجت کی تربیت کے سلسلے میں بھی مؤلف نے عرق ریزی کے ساتھ بچوں کی نفسیات کا مطالعہ کرتے ہوئے کارآمد ومفید باتیں بتائی ہیں جو بہر طور لائق مطالعہ ہیں۔

''فن تربیت کے کچھ پہلو'' کے عنوان سے چوتھے باب میں بچوں کی نفسیات کے پیش نظر ہر ہر نکتہ کو خوبصورت اور دلچسپ مثالوں سے پیش کیا گیا ہے، اس میں ان مسائل کو بھی ابھارا گیا ہے، جن کے پیش آنے پر بچے ذہنی الجھنوں کا شکار ہوتے ہیں اور ان کا مناسب ترین حل بھی پیش کیا گیا ہے۔ یہ باب تقریباً دس فصلوں پر مشتمل ہے، جسے "تلك عشرة كاملة" سے بھی تعبیر کیا جاسکتا ہے جو علی الترتیب ''توجہ کی چاہت اور پریشان کن برتاؤ'' سے شروع ہو کر بچوں کو احساسِ ذمہ داری، حوصلہ افزائی، انھیں باتوں کو توجہ کے ساتھ سننے پر زور دینا پیش آمدہ مشکلات کے ممکنہ حل، بچوں کو نظم و ضبط اور ادب سکھانے جیسے امور کو عبور کرتے ہوئے نوجوانی کی حدود میں داخل ہو جاتی ہے، اس کی بعض خصوصیات کی طرف والدین کو متوجہ کرنے کے بعد بچوں سے ہونے والی غلطیوں یا نقصانات پر دی جانے والی سزا، بچوں کی پرورش کے سلسلے میں خاندانی مشاورتی ملاقاتوں کے پیشِ نظر تربیت میں ''حقیقت پسندی اور امیدیں'' پر کتابی سلسلہ تکمیل کو پہنچ جاتا ہے۔

کوئی انسان غلطیوں اور بھول چوک سے مبّرا نہیں اس کا اظہار ان تسامحات سے ہوتا ہے جو کتاب میں کہیں کہیں پائے جاتے ہیں، مؤلف کتاب اور ترجمہ نگار دونوں نے جن جداول کو پیش کیا ہے ان میں بھی نظر ثانی کی ضرورت ہے، جداول اگرچہ بہت قیمتی اور بہت مفید ہیں لیکن انھیں ان جگہوں پر نہیں دیا گیا جہاں دیا جانا چاہیے تھا، مثلاً دوسرے باب کی بارہویں فصل میں ''کھیل'' عنوان کے تحت ص ۱۹۸، ص ۱۹۹ پر جو چارٹ عمر کے لحاظ سے پیش کیا گیا ہے وہ بھی جدول میں شمار ہونا چاہیے تھا جو نہیں کیا گیا۔ دوسرے یہ کہ کتاب کے ابتدائی ساٹھ فیصد صفحات (۲۵۰ صفحات تک) کسی بھی جدول کو نہ دینا اور ص ۲۵۱ تا ۲۲۳ چھ جداول پیش کرنا اور ساتواں، آٹھواں جدول کتاب کے آخیر میں لانا قاری کو مؤلف کی بے ترتیبی کا احساس دلانا ہے یا تو تمام جداول کتاب کے ابتدائی، درمیانی یا آخری حصے میں ایک ہی جگہ ہوتے یا پھر ہر باب کے آخیر میں اس سے متعلقہ فصول کے ضمن میں الگ الگ چارٹ آتے تو کتاب کی افادیت دوچند ہو جاتی۔

المختصر کتاب بہر طور لائق مطالعہ ہے، اس کے پرکشش عنوانات، نفسیاتی مباحث، دلچسپ مثالیں، بچوں کی تربیت میں بے انتہا معاون و مددگار ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کے لیے مؤلف، مترجم اور ناشر سبھی مبارکباد کے مستحق ہیں۔ جنھوں نے اردو قارئین کو ایک ایسی کتاب کی سوغات پیش کی جس کے مطالعہ سے نہ صرف یہ کہ نئی نسل کو ایک بہترین ذمہ دار، بااخلاق و کردار، شہری بنانے میں تعاون ملے گا بلکہ ماضی کے بھولے ہوئے سبق کو یاد دلانے میں بھی ایک اہم کردار ادا کرے گی۔

اللہ کرے یہ کتاب مقبولِ بارگاہِ الٰہی ہو اور اس کی مفید تعلیمات سے ملت اسلامیہ پوری طرح بہرہ ور ہو سکے۔

☆☆☆